# چادرِ صحرا

(انتخاب غزلیات)

ساغر صدیقی

مرتب

یونس ادیب

مکتبۂ عالیہ — ایبک روڈ — لاہور

# چادرِ صحرا

ساغر صدیقی

مرتب : یونس ادیب

ناشر : الطاف حسین

سرورق : اسلم کمال

طابع : ندرت پریس - لاہور

کتابت : ممتاز احمد

قیمت

۳۵/



یکے از مطبوعات

مکتبۂ عالیہ — ایبک روڈ — لاہور

# بندۂ شعور

—— فرخندہ لودھی ——

مجھے یہ نہیں معلوم کہ ساغر صدیقی کس قبیل کا آدمی تھا ۔ وہ قلندر تھا بھی یا نہیں ؟ عرفان و آگہی کی کونسی منزل اس کا مطمحِ نظر تھی ۔ میں نے جب اس کی شاعری پڑھی تو فقط اتنا اندازہ ہوا کہ وہ مقتول ہے جسمانی طور پر ہمارا شکار ۔ وہ کس بار مروی سے قتل ہوا اور پھر اپنی بے گور لاش اپنے کندھوں پر اٹھائے شہر کی نجان سڑکوں پر پھرتا رہا ۔ چوراہوں میں مجسمے لگاتا رہا ۔ اور شعر و سخن کو پنجاب کی صوفیانہ روایت کے مطابق نبھاتا رہا ۔ شاہ حسین ، بلھے شاہ ، وارث شاہ اور میاں محمد بخش کے قلندرانہ مسلک کا پیرو شاعر ، ساغر صدیقی انہیں عالوں موت سے ہمکنار ہوا جو ایسے بڑے شاعروں کا مقدر ہوتی ہے ۔ ان شاعروں اور ساغر صدیقی میں صرف زبان کا فرق ہے ورنہ وہ اسی روایت کو لے کر لاہور کے گلی کوچوں ، بازاروں ، فٹ پاتھوں پر ڈیرا لگاتا تھا جو پنجاب کے ان بڑے صوفی شعرا کی ریت تھی ۔

اسے صرف یہ معلوم تھا کہ سفر شرط ہے مسافر نواز بہیں تو نہ سہی اس لئے وہ اپنی موت کے بعد اپنی لاش کو سیاہ چادر میں لپیٹے سیاہ راستوں پہ شعر و سخن کی شمع جلاتا چلا ۔ سیاہ پوشی مسترلوشی سے اگلا مرحلہ ہے ساغر اس مرحلے سے جس طرح گزرا اس سے لگتا ہے کہ اس نے زمانے کے دیئے ہوئے زخموں کا بھرم رکھ لیا ۔ اندھیرے کا ذکر میں اس لئے کر رہی ہوں کہ شاعر کے روشن کلام میں جابجا اندھیرے کا ذکر ملتا ہے ۔ زلف کی سیاہی اور

الجھاؤ کا تذکرہ عام ہے مثلاً ؎

وہ گیسوئے جاناں ہوں ساغر یا گردشِ دوراں کے سائے
اے وائے مقدر دونوں سے الجھن کی توقع رکھتے ہیں

ساغر کے بارے میں سنا ہے کہ وہ پیشے کے اعتبار سے شانہ ساز تھا۔ تمام عمر شدید احساسِ شانہ سازی کے باعث معاشرے کے الجھے سیاہ گیسو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا اور خود بقولِ غالب ؎

حسرتِ عرضِ تمنا یاں سے سمجھا چاہیئے
دو جہاں حشرِ زبانِ خشک ہیں جوں شانہ ہم

ساغر صدیقی صرف شانہ ساز شاعر رہتا تو بھی کچھ کم نہ تھا ساغر ہوا تو گردش میں رہنا لازم ٹھہرا۔ اس کے کلام کو چکھنے والے یا پینے والے مدہوش ہونے کے بجائے اپنے حواس سمیت سوچتے ہیں کہ اس جام میں اپنے دور کا کتنا سفاک شعور ہے۔ احساس کی جس بساط سے وہ زمانے کو دیکھتا ہے ہوش کے جن زاویوں سے گردشِ دوراں پر روشنی ڈالتا ہے۔ ہوش و خرد کا یہ انوکھا اظہار اسے اپنے دور کا نقیب بنا دیتا ہے۔

ساغر کے کچھ دوست اُسے دیوانہ کہتے تھے میں نہیں مانتی۔ میرے خیال میں فرزانگی کے جس معیار سے اس نے اپنے عہد کے انسان کو دیکھا اُسی معیار کی وجہ سے لوگ اسے دیوانہ کہنے لگے۔ ہم اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے انسان ہر لمحہ ہوس کے چکر میں ہیں۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں۔ ساغر کو ان چکرائے ہوئے لوگوں کا پتہ تھا۔ وہ ان سے کنارہ کش ہو گیا۔

اس کی شاعری تقسیم ہند کے بعد پاکستان کی نئی قوم کے رویے کا نوحہ ہے جس کے لئے ایک فلسفی شاعر نے برسوں عظمت کے ترانے بنائے۔ تاریخ اسلام کے اوراق سے نئی قوم کی تعمیر کی۔ خواب دیکھا گیا اس خواب کی تعبیر دیکھنا اقبال کی قسمت میں نہیں ساغر کے مقدر میں تھا کہ وہ اس اوراق سے بنے ہوئے ملک کی گلیوں میں پریشان پھرے۔ ساغر آوارہ پھرتا رہا مگر اس نے یہ کہیں نہیں کہا کہ ؎

کاغذی ہے پیرہن "اس" پیکرِ تصویر کا

جیا اور امید کے ساتھ جیا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء نے جو بارڈر لائن کھینچی تھی ساغر خالصتاً اس لائن کے اس پار کا شاعر ہے۔ س نے شاعرانہ توقعات کے ساتھ بارڈر کراس کیا۔ نئے ملک کی سرزمین پہ سرشار گھوما پھرا لوگوں سے

بلا دیکھا تو وقت ہر ہاتھ میں زہر کا پیالہ تھما چکا تھا۔ سقراط باری باری مر گئے، ساغر بھی مر گیا۔ مگر اس کی آواز بازگشت کی مانند کبھی ریڈیو کی وساطت سے اور کبھی اخباروں کے باعث کانوں تک پہنچتی رہی۔ اس نے کہا ؎

دستور یہاں بھی گونگے ہیں فرمان یہاں بھی اندھے ہیں
اے دوست خدا کا نام نہ لے ایمان یہاں بھی اندھے ہیں
بے رنگ شفق سی ڈھلتی ہے بے نور سویرے ہوتے ہیں
شاعر کا تصوّر بھوکا ہے سلطان یہاں بھی اندھے ہیں

ساغر بے چارا اپنے آپ کو یہ باور نہ کرا سکا کہ پاکستان نظریاتی مملکت نہیں سیاست والوں کا اکھاڑا ہے۔ سیاست جدید اصطلاح میں سائنس کا درجہ رکھتی ہے۔ پرانے وقتوں کے لوگ اسے لومڑ پیچی کہتے تھے یہاں اسی لومڑ پیچی کا راج تھا جسے سیاست دان جمہوریت کا نام دیتے تھے۔ ان کی جمہوریت لومڑ راج کا ایک اچھا سا نام ہے۔ جنگل میں ایک لومڑی نچلی نہیں بیٹھتی یہاں گروہ در گروہ پھرتی ہوں اس مقام کا کیا حال ہو۔ پچھلے تیس برسوں سے ایک ساغر تو کیا جانے کتنے لوگ گردش میں ہیں۔ ساغر صدیقی حوصلہ مند اور جدّت پسند تھا کہ احتجاج اور بائیکاٹ کی ایک صورت نکال لی۔ تصوف کی دھونی رمائے دھوئیں کے بیچ رویا اور فرسودہ نظام کی فرسودہ روایتوں اور کرم خوردہ ضمیروں سے دوسروں کو خبردار رکھنے کا فریضہ انجام دیتا رہا۔ اس کی کوئی سی غزل اٹھالیں اس میں ایک آدھ شعر ایسا ضرور نکل آئے گا جو منفی قوتوں کی نشان دہی کرتا ہے۔

بے وجہ تو نہیں ہیں چمن کی تباہیاں
کچھ باغباں ہیں برق و شرر سے ملے ہوئے

ساغر کو آسمان سے گلا نہیں، اسے وقت سے شکایت ہے۔ وقت انسان کے روپ میں کیسے کیسے چکر لگاتا ہے اور کیا کیا رنگ بدلتا ہے۔ ساغر کہتا ہے ؎

کچھ حال کے اندھے ساتھی تھے کچھ ماضی کے عیار سجن
احباب کی چاہت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

ضرورتِ راہ کے مطابق مسافروں نے بھی سیکھ لی ہے
وہ رہزنی مدتوں رہی ہے جو رہبروں کا شعار بن کر

ایک اور جگہ یہ بندۂ شعور کس قلندرانہ انداز سے اپنے عہد کے معصوم لوگوں کو آگاہ کرتا ہے ؎

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے

ابھی فریب نہ کھاؤ بڑا اندھیرا ہے

سنا ہے ساغر کے دوستوں کو اس بات کا دکھ ہے کہ اس کے کلام کو نقادوں نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ کسی نے اس پر کبھی کچھ نہیں لکھا تو دوستو! نقیب کو ڈھولوں تاشوں کی ضرورت نہیں ہوتی اس کے لئے لوگ اپنے کان کھلے رکھیں تو لوگوں ہی کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ نہیں کھُلے رکھتے تو نقیب کی بلا سے۔ وہ حق بات کہتا گزر جائیگا۔

میں نے اس سیاہ فام، سیاہ پوش، سیاہ بخت کو زندگی میں صرف ایک بار دیکھا تھا وہ ریڈیو پاکستان کے لاہور سنٹر میں بیٹھا تھا۔ میں نے سوچا کوئی سائیں اختر ٹائپ لوک گویا ہے۔ غور سے دیکھا تو گویوں والی کوئی بات نہ تھی۔ اس کے ہاتھ لرزاں تھے اور سانس اکھڑی ہوئی۔ وہ نئی چھپی ہوئی کتاب پکڑے ہوئے تھا جسے مسلسل الٹ پلٹ رہا تھا۔ کسی نے میرا اور اس کا تعارف نہیں کرایا۔ اگرچہ ریڈیو سٹیشن کے ماحول میں اس فقیر کو دیکھ کر میرا تجسس بڑھ رہا تھا۔ آس پاس بیٹھے لوگوں نے شاید اس لئے تعارف ضروری نہ سمجھا کہ ساغر کی سماجی حیثیت کچھ نہیں تھی اور میں بھی کچھ نہیں ہوں۔ ساغر اٹھ کر چلا گیا تو میں نے اے حمید سے پوچھا:۔

"یہ کون ہے؟"

"ساغر ہے گا اے۔" اے حمید نے جواب دیا

"او۔ بڑے اندھیرے والا شاعر۔" میرے ذہن نے کہا۔ مجھے سخت افسوس ہوا کہ مجھے تن کے کالے اور من کے اجلے شخص سے ملنے کا موقعہ ملا —— مگر نہ ملا۔

پھر میں نے یونس ادیب کی مدد سے ساغر کو، جو ایک شخص تھا، دیکھا۔ اس کے کلام کی مدد سے ساغر کو، جو ایک شاعر تھا پڑھا - دونوں کو یکجا کر کے سمجھا تو ساغر ایک علامت نظر آیا۔ ایک طبقے کا نمائندہ ثابت ہوا جسے پستے ہوئے برس ہا برس گزرے۔ نہ جانے کتنے اور ساغروں کو اس طبقے کی نمائندگی کا فرض سونپا گیا ہے جنہوں نے ؎

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے

جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

چھپائے دل میں غموں کا جہان بیٹھے ہیں

تمہاری بزم میں ہم بے زبان بیٹھے ہیں

یہ اور بات کہ منزل پہ ہم پہنچ نہ سکے
مگر یہ کم ہے کہ راہوں کو چھان بیٹھے ہیں

اس کے رویے کی بنا پر کچھ لوگ اسے مغرور، بھگوڑا اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہوں گے۔ اس پر رومان پسندی، رجعت پسندی، یاس انگیزی کا الزام لگاتے ہوں گے اور یہ بھی کہیں گے کہ وہ کسی نظریے کے ساتھ COMITTED نہیں تھا۔ اس کے پاس کوئی مشن نہ تھا کوئی جماعت نہ تھی۔ اس کی صدا نہ تو پیغمبرانہ اور حکیمانہ تھی نہ ناصحانہ اور راہبرانہ۔ ایک شاعر تھا جیسے اور بہت سے شاعر ہوتے ہیں لیکن کوئی فیصلہ دینے سے پہلے اتنا خیال رہے کہ اس کی صدا دوستانہ تھی فقیرانہ تھی ؎

دو قدم رائیگاں ہوئے ہیں تو کیا
دو قدم اور جستجو کر لو

زمانہ کہہ رہا ہے میں نئی کروٹ بدلتا ہوں
انوکھی منزلیں ہیں کچھ نرالے رہنما چن لیں
کوئی نیا رنگ بخش اس کو کوئی نئی روح پھونک اس میں
گریز کرنے لگیں گے ورنہ حدیثِ یزداں سے لوگ ساقی

مجھے یہ نہیں معلوم کہ ساغر زندگی میں کن حالات سے دوچار تھا۔ اس کے سوشل بائیکاٹ کے ذمہ دار کون لوگ تھے۔ بہر کیف میں یہ جانتی ہوں کہ بحیثیت ایک پاکستانی شہری اس کے قاتلوں میں نادانستہ میں بھی شامل ہوں اور آج اس کے معلوم یقین اور بے ریا عظمت کو سلام کرتی ہوں۔

# ساغر ــــ فن اور شخصیّت

ــــ یونس ادیب ــــ

میں نقاد نہیں ہوں، میں نے شعروں پر تنقیدی انداز سے کبھی کچھ نہیں لکھا لیکن میں نے شاعروں کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور شاعروں کے بارے میں لکھتے وقت میرے سامنے دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک شاعر کی ذات اور دوسری ان کے شعر، اس سلسلے میں ساغر کی شاعری کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ساغر کی ذات کو اس لئے الگ نہیں کر سکتا کہ اس کے شعر اور اس کی ذات الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ میرے نزدیک "تنقید کا یہ انداز بالکل روائتی ہے کہ شاعر کی شاعری سے اس کی ذات کو الگ کر دیا جائے۔ ساغر آج کے دور کا ایک ایسا شاعر ہے جس کو سمجھنے اور پڑھنے کے لئے روائتی تنقید کی آب و ہوا کوئی مدد نہیں کر سکتی اور نہ ہی روائتی اندازِ تنقید سے ساغر کے بارے میں انصاف سے کوئی بات کہی جا سکتی ہے، کیونکہ اگر وہ فٹ پاتھ پر رہا ہے تو اس نے شعر بھی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر لکھے ہیں ایسا نہیں ہوا کہ اس نے شعر کسی دفتر میں لکھے ہوں اور انہیں فٹ پاتھ پر سنایا ہو یا فٹ پاتھ پر شعر لکھے ہوں تو اس نے انہیں کسی دفتر میں سنایا ہو۔ ساغر کی غزلوں کے انتخاب کے دوران ساغر اس طرح میرے سامنے آجاتا ہے جس طرح وہ زندگی کے مختلف موڑوں پر مجھے دکھائی دیتا رہا ہے۔ اور اس وقت جب میں اُس کے بارے میں لکھ رہا ہوں تو ساغر اپنی شخصیت اور اس میں چھپے ہوئے ایک درویش کی تمام وارداتوں کے ساتھ میرے سامنے ہے اور ہر شعر کے مفہوم میں اس کی ذات مرکزی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ وہ مجھے اپنے شعروں کے اسرار کی وادیوں میں لے گیا ہے اور اس کے دل کے معاملات پر پڑا ہوا ایک ایک پردہ اُٹھ رہا ہے

غالب نے کہا تھا

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

ساغر کے شعروں کا انتخاب بھی اس کے دل کے معاملے کو کھولنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے باطن میں جس تجربے کو حاصل کیا۔ اسے تمام عمر اپنی تباہ حالی کے پردے میں دنیا سے چھپائے رکھا۔ دیکھنے والوں کی نگاہیں اس کے نحیف و نزار جسم سے چمٹی ہوئی بوسیدہ سیاہ چادر سے آگے نہ دیکھ سکیں اور نہ ہی وہ اس بات کا آرزو مند تھا کہ اس نے اپنی ذات کی تکمیل اور اپنے اندرونی خلا کو پُر کرنے کے لئے جس جانگسل سفر کو اختیار کیا تھا۔ لوگ اس سے آشنا ہوں لیکن وہ اپنے آپ کو اپنے تخلیقی جذبے سے نہ چھپا سکا اور اس نے تکمیلِ ذات کی راہ میں ہر اس لمحے کی واردات اور کیفیت کو شعروں کے حوالے کر دیا۔ اس لئے وہ شاعر تھا اور نازک سے نازک خیال اور تجربے کے اظہار کا اسے جو کمال حاصل تھا اس کے دل کے معاملوں کا رازدار بن گیا اور ساغر کو سمجھنے کے لئے اس کا یہی کمال ایک باوثوق ذریعہ ہے۔

ساغر کے شعری ادب کے فنی محاسن اور اس کے تخلیقی عمل کو تنقید کے ترازو میں تو کوئی نقاد ہی تول سکتا ہے۔ میں صرف اس کا تیس سال تک رفیق ہونے کی حیثیت سے اس کے باطنی تجربے اور زندگی و کائنات کے بارے میں اس کے رویوں کا ایک گواہ ہوں، ان تمام کیفیات کا عینی شاہد ہوں جو اس کے شعری ادب کی بنیاد ہیں اور اس کے شعر پڑھتے ہوئے ہر وہ کیفیت عکس و سایہ کی طرح میرے شعور پر پھیل جاتی ہے جس نے ساغر کو ہر آن اپنے غلبے میں لئے رکھا اور پُراز اسرار کیفیات کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ساغر دیکھنے والوں کے لئے معمہ بنا رہا۔

ساغر سچ مچ ایک معمہ تھا۔ اُن دیکھنے اور سمجھنے والوں کے لئے جو اپنی ذات اور وجود کے روحانی پہلو سے بے خبر اور صرف سماجی و معاشرتی تقاضوں کے اسیر ہیں اور توقعات کے فریب میں الجھی ہوئی دنیا کے طلبگار ہیں۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ساغر اپنی ابتدا سے اپنے مادی وجود میں دنیا اور اس کے تقاضوں سے بے نیاز رہا۔ اس نے زندگی کی آسائشوں کی طرف کبھی حریص آنکھوں سے نہ دیکھا اور نہ ہی ان کی خواہشوں کے طلسم میں گرفتار ہوا۔ درحقیقت اسے جو فنی شعور اور تخلیقی جوہر ودیعت ہوا تھا۔ وہ سطحی نہیں تھا۔ لہٰذا اس کے فنی شعور کی حدیں مادی زندگی سے ماورا تھیں، چنانچہ وہ اپنے ابتدائی شعروں میں بھی ایک ایسی دنیا کا

متلاشی نظر آتا ہے، جو موجود تو ہے، لیکن دکھائی نہیں دیتی، وہ اپنی ذات کی گھمبیرتا سے باہر نکلنے کی تڑپ میں مبتلا نظر آتا ہے اور یہ ایک بہت ہی عجیب وغریب تجربہ ہے۔

ساغر اس تجربے سے بھی پوری طرح مالا مال نظر آتا ہے لیکن یہ تجربہ یہاں ہی ختم نہیں ہو جاتا کیونکہ کسی کا اپنی ذات کے خول سے نکلنے کا مطلب اپنے باطنی خلاء کو اس حد تک محسوس کرنا ہے کہ بیرونی یعنی گردوپیش کی زندگی بے معنی نظر آنے لگے اور اس تجربے سے دوچار انسان اپنے وجود کے حقیقی مقصد کی کھوج میں اپنے جسمانی وجود سے اتنا بے تعلق ہو جائے کہ دیکھنے والوں کے لئے تو ایک جسمانی وجود ان کے سامنے ہو لیکن باطنی طور پر وہ غیر حاضر ہو۔

اس غیر معمولی تجربے کے ابتدائی نقوش ساغر کے ہاں غیر معمولی حیرت میں نظر آتے ہیں۔ اور وہ اپنی ابتدائی زندگی میں حیرت کے دروازوں پر بے تابانہ دستک دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ حیرت عرفانِ ذات اور وجودِ حقیقی کے حصول کا پہلا مرحلہ ہے۔ کیونکہ جستجو کے مسافروں کے سفر کا آغاز حیرت کے سنگِ میل سے ہوتا ہے جو ان کے عقلی حواس اور حاصل شدہ معلومات کے شعور پر پوری طرح چھا جاتی ہے۔ پھر جستجو کی راہ میں حیرت زدہ ہونے والا اپنے اندر ہی اندر ڈوبتا چلا جاتا ہے اور جب مانوس بسیروں، خواہشوں اور تمناؤں حتیٰ کہ اپنی ذات تک سے بھی دستبردار ہو جاتا ہے تو تب وجدان اس کی راہنمائی کرنے لگتا ہے۔

حیرت سے وجدان تک کے طویل سفر کے دوران ساغر صدیقی جس پروسس سے گذرا وہ بیان تو نہیں کیا جا سکتا لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے جب وہ پہلی مرتبہ مجھے دہلی دروازہ کے باہر لاہور کے مشہور علمی، ادبی ادارے حلقۂ اربابِ علم میں ملا۔ تو وہ دیکھنے میں ایک ایسا عام سا نوجوان نظر آتا تھا جو صاف ستھرے کپڑے پہنتا تھا۔ سیاہ گھنگھریالے بالوں کو بڑے پیار سے سنوارتا تھا اور اپنے تخلیقی عمل میں بڑا پرجوش تھا۔ لیکن اس کی خوبصورت اور موٹی موٹی کیف آور آنکھوں میں بے چینیوں کے سائے اتنے گہرے تھے کہ سمجھ نہیں آتی تھی کہ اس کی بے چینیوں کا مرکز کہاں ہے۔ اس کی کیف آور لیکن ہر وقت سوچ میں ڈوبی ڈوبی آنکھوں سے زیادہ اس کے عام اخلاقی رویے نے بھی مجھے اس کے بہت قریب کر دیا۔ وہ امرتسر سے لاہور آتا تو پیسہ اخبار میں حافظ امرتسری کی دکان یا حلقۂ اربابِ علم کے اجلاس میں مل جاتا۔ وہ بہت کم باتیں کرتا اور جب میں اسے مخاطب کرتا تو وہ اس طرح چونک پڑتا جیسے ایکدم کسی بہت طلسمی خیال سے اس کا ناطہ ٹوٹ گیا ہو۔ قیامِ پاکستان تک اس سے جتنی بھی ملاقاتیں ہوئیں، میں ان کو یاد کرتا ہوں تو مجھے وہ حیرت کی نہ ختم ہونے والی وادیوں میں گم نظر آتا ہے اس دور کے اس کے شعروں میں جھانکیں تو الفاظ کے پردے میں بھی وہ اپنی اسی کیفیت کے بیساختہ

اظہار کے لئے تڑپتا دکھائی دیتا ہے۔

شروع شروع میں دوسرے دوست بھی میرے اس خیال سے متفق تھے کہ ساغر پر کسی لڑکی نے جادو کر دیا ہوا ہے کیونکہ روائتی شاعری کرنے والوں کا مرکز ایک لڑکی ہی ہوتی تھی لیکن لاہور میں سڑکوں پر گھومنے کے دوران اور انار کلی میکلوڈ روڈ کے ہوٹلوں میں اس سے ہونے والی طویل باتوں سے اس خیال کی ہرگز تصدیق نہیں ہوتی تھی۔ لیکن وہ کسی گہری المناکی کی زد میں ضرور تھا۔ جیسے وہ کسی انجانی حقیقت کی کھوج میں ہو، اور ناپسندیدہ گردوپیش کو برداشت کرنے کے لئے اس کی خود اختیاری مدہوشی کا باعث بھی یہی حقیقت ہے۔

بعض اوقات میں کریدتا تو وہ اتنا کہہ کر چپ ہو جاتا کہ "مجھے خود پتہ نہیں کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور کیوں جا رہا ہوں"۔ اس کی ان باتوں سے یوں لگتا تھا کہ وہ تیزی کے ساتھ اپنے آپ سے جدا ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے شعروں میں ایک عجیب نیا پن پیدا ہو رہا تھا۔ وہ مبہم سے مبہم خیال کو بڑی خوبصورتی سے دوسروں تک منتقل کر دیتا اور جو چیز اس کے شعروں میں سامعین کو متاثر کرتی، وہ اس کے لہجے کا کھرا پن اور جذبے کی صداقت تھی۔ وہ اپنی شعری زندگی کے آغاز سے ہی پسند کیا جانے لگا تھا۔ اس کی آواز میں ترنم تھا اور پھر اس کی روح کے انجانے سوز اور کرب نے اس کی آواز کو دلوں اور ذہنوں میں اترنے کی قوت بخش دی تھی، لاہور اور دہلی ان دنوں مشاعروں کے مرکز تھے امرتسر ساغر کا مسکن تھا اس حوالے سے اس کے شعر برصغیر میں پسند کئے جاتے تھے یہ وہی زمانہ تھا جب جگر مراد آبادی نے ایک مشاعرے میں ساغر سے غزل سنی تو انہوں نے ساغر کو سینے سے لگا لیا۔ انہوں نے ایک بھری محفل میں ساغر کے بارے میں کہا کہ پنجاب میں ساغر صدیقی نے اردو غزل گوئی کو نیا آہنگ دیا ہے۔ اور ساغر کی غزلوں کے آہنگ کا سرچشمہ اس کی تنہائیوں کا وہ راز ہے جو بچپن سے لے کر شعور کی حدوں کو عبور کرتے تک اس کی روح کا زخم بنا رہا۔

تنہائیاں اسے ورثے میں ملی تھیں۔ اس کی ذاتی تحریروں میں اس بات کا سراغ ملتا ہے کہ وہ ماں کی مامتا اور باپ کی شفقت سے پیدائش کے ساتھ ہی محروم ہو گیا تھا اور وہ یہ جاننے کے لئے کہ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا ہے۔ ان سوالوں کے ساتھ سولی پر خود ہی مصلوب ہو گیا کہ میں کون ہوں۔

ساغر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ۔

"میں نہیں جانتا کہ میری ماں کون ہے اور میرا باپ کون ہے۔ ہو سکتا ہے کسی نے میرے اطمینان کے لئے کہہ دیا ہو کہ یہ میری ماں ہے اور یہ میرا بھائی ہے میں نے ایک ویران مکان کی افسردہ دیواروں

کے ساتھ لگے ہوئے لکڑی کے پرانے صندوقوں میں دیمک چاٹتی کتابوں کے درمیان آنکھ کھولی۔ اردو میں نے اسی گھر میں پڑھی۔ حبیب حسن نامی بزرگ کی نگرانی میں تعلیم و تربیت پائی اور مجھ میں شاعری کا شوق پیدا ہوا"

کسی باشعور انسان کے لئے یہ تجربہ بڑا ہی حیرت ناک ہے کہ وہ اس دنیا میں ساغر ایسے المیے کے ساتھ پیدا ہوا ہو۔ کہتے ہیں ان دنوں ساغر امرتسر کے ہال بازار میں شانہ سازی کرتا تھا اور ایک ہنرور خاندان سے وابستہ تھا۔ ممکن ہے حبیب حسن نامی بزرگ کی وفات کے بعد معاشی ضروریات نے اسے شانہ سازی کی صنعت میں داخل ہونے پر مجبور کر دیا ہو لیکن امرتسر کا علمی ادبی ماحول اور سیاسی تحریکوں کا پُرجوش عمل اس کے تخلیقی شعور کی نشوونما کے لئے بڑا سازگار ثابت ہوا۔ ساغر نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ وہ شروع ہی سے ہزاروں خیالوں کی یلغار میں رہتا تھا، سوچوں، سوالوں اور وسوسوں کی وسیع دنیا اس کے ذہن میں آباد تھی اور وہ ان سب کا جواب سننے کے بعد بے تاب ہو جاتا تو اس کی بے تابیاں اظہار کا پیکر بن جاتیں۔ میرا خیال ہے اگر اس نے کسی مصور کی نگرانی میں وقت گذارا ہوتا تو وہ تصویروں اور رنگوں کے ذریعے بے تابیٔ دل کا اظہار کرتا۔ علم و ادب کے ماحول میں اسے شعری شعور ہی مل سکتا تھا لہٰذا اردو غزل اس کے اندرونی وسوسوں اور سوچوں کے اظہار کے لئے بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوئی۔

ساغر صدیقی جو ابتدا میں عام انسانوں کے درمیان جہاں اپنے تخلیقی عمل سے الگ تھلگ نظر آتا ہے وہاں باطنی طور پر بھی الگ تھلگ ہی تھا۔ وہ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں صرف اظہار کے لئے شریک ہوتا۔ اسے نہ انجمنوں کے عہدوں سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ اپنے شعروں کو اقتصادی عمل کا ذریعہ بنانے کی طلب تھی۔ رفتہ رفتہ وہ مشاعروں سے بھی دامن بچانے لگا۔ شانہ سازی سے اسے جو کچھ مل جاتا، اسی پر قناعت کر لیتا۔ وہ تو صرف اپنے اندر کی تلاش کرنے کے عمل میں اتنا مصروف رہتا تھا کہ جب قیام پاکستان کے بعد لاہور آیا تو اس کا یہ عمل زیادہ ہی تیز ہو گیا۔ حالانکہ دہلی اور مشرقی پنجاب کے ادیبوں اور شاعروں کے لاہور آنے سے یہاں کی ادبی زندگی میں بڑی چہل پہل ہو گئی تھی۔ ہر روز کہیں نہ کہیں مشاعرے ہوتے، ادبی محفلیں منعقد ہوتیں اور ساغر بھی ان محفلوں میں پُرجوش طریقے سے شریک ہونے لگا۔ جو اپنے لب و لہجہ اور خیال و فکر سے منفرد حیثیت اختیار کر رہا تھا۔ اس کے مداحوں کا حلقہ پھیلتا جا رہا تھا اور پیشہ وارانہ رقابت اور منافقت کے مارے ہوئے شاعر بھی اس سے جلنے لگے تھے، لیکن اس پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے اسے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہی ادبی علمی محفلیں اور مشاعرے اس کا اوڑھنا بچھونا تھے۔

اسے تو تخلیق کا کرب اور شناخت کا وسوسہ گھیرے ہوئے تھا۔ پاکستان بننے کے بعد جعلی کلیموں اور آبادکاری کے عمل سے جس منافقت، جھوٹ اور فریب کاری کا دور شروع ہوا، ساغر کو اس سے شدید نفرت تھی اور اس نے دیوسماج روڈ والا وہ کمرہ بھی چھوڑ دیا جہاں امرتسر سے آنے کے بعد اس نے قیام کیا تھا۔

یہ بات نہیں کہ کمرہ چھوڑنے سے پہلے اس نے کسی اور کمرے کا بندوبست کر لیا تھا۔ وہ ایک ایسے اعتماد کے ساتھ باہر آیا تھا جو خاص طور پر ان افراد کے کردار سے جھلکتا ہے جنہیں اس وسیع و عریض کائنات اور صبح و شام کی گردش کے اسرار میں اپنے وجود کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی زندگی کے مقصد سے اگر آشنا نہیں ہوتے تو انہیں کسی عظیم تر مقصد کی جستجو ضرور ہوتی ہے، یہ دونوں حالتیں ساغر کو درپیش تھیں اور اسے یہ بھی پتہ تھا کہ منزل انجانی ہے اور راستہ دشوار ہے لیکن اس نے دیوانہ وار جدوجہد کا عزم جس شجاعت بھرے انداز میں کیا تھا۔ یہ اسی کا حصہ تھا۔ جستجوئے حیات کی دشواریوں کا سامنا کرنے کے لئے اس کے پاس صرف تخلیق شعر کا ہتھیار تھا اور جس خارجی اور داخلی کشمکش نے اس کے ذہن میں ہلچل مچا رکھی تھی۔ اس کے لئے ایک ایسا بحران تھا جو عموماً ہلاکت آفریں ثابت ہوتا ہے لیکن ساغر نے اپنے شعور کی روشنی میں سب سے الگ تھلگ راہ اس لئے اپنائی کہ وہ اس انوکھے تجربے سے دوچار ہونے کے لئے غیر ارادی طور پر بے تاب تھا۔ جس کے بعد انسان کائنات اور اپنے درمیان گمشدہ رشتوں کو تلاش کر لیتا ہے اور وہ محدود سے نکل کر غیر محدود کے غلبے میں آ جاتا ہے۔

ساغر درحقیقت اسی تجربے سے آشنائی اور اس کے حقیقی ثبوت کے لئے پیدا ہوا تھا اور آج کے اس دور میں جہاں انسانوں کی غالب اکثریت مختلف لبادے اوڑھ کر دنیا اور اس کی آسائشوں کے حصول کے لئے تگ و دو میں مصروف ہے اور اپنی اندھی خواہشوں کی تکمیل کے لئے انسانی قدروں کو روندتی چلی جا رہی ہے۔ ساغر نے ایک حوصلہ مند مسافر کی طرح اپنے آپ کو انجانی منزلوں کی طرف لے جانے والے راستوں کے سپرد کر دیا۔

روٹی کپڑے اور مکان کی ضرورت سے دستبردار ہونے کا ساغر کا فیصلہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں تھا، اس معاشرے میں جہاں ہر انسان روٹی کپڑے اور مکان کے پیچھے تیزی سے دوڑ رہا ہے۔ ساغر کو ایک جگہ ٹھہرے ہوئے دیکھ کر نام نہاد انسانوں کی اس سوسائٹی نے اسے بزدل اور مفرور قرار دینے میں

بڑی جلد بازی کا ثبوت دیا۔ ساغر کو جو اس فیصلے سے رسوائیاں ملیں ایک فنکار کی حیثیت سے اسے بے حد ملال ہوا۔ وہ کس کس کو سمجھاتا کہ غیر مرئی قوتیں اسے کس سانچے میں ڈھال رہی ہیں۔ اسے سوسائٹی سے الگ تھلگ ہونے کا تو کوئی غم نہیں تھا لیکن اس کے فنکارانہ احساس کو بے حد چرکے لگ رہے تھے، وہ اپنے سامنے اور غیر موجودگی میں اپنے بارے میں ہونے والی باتیں سُنتا تو چپ ہو جاتا۔

نہ اس نے روٹی کے لئے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور نہ سر چھپانے کی جگہ کے لئے کوئی آرزو کی، سڑکیں، ہوٹل اور فٹ پاتھ اس کے اس عمل کے سب سے بڑے گواہ ہیں، جس سے وہ باطنی وجدان سے آشنا ہوا۔ ان دنوں اس کی غزلیں "چراغِ طُور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے" اور "جھوم کر گاؤ میں شرابی ہوں" بہت مقبول ہوئیں۔ اسے مشاعرہ باز گھیر گھار کر مشاعروں میں لے جاتے، وہ غزلیں سناتا، ایک نہیں دو تین اور ترنم کے پیچھے چھپا ہوا پُر خلوص درد سننے والوں کو تڑپا کر رکھ دیتا۔ مشاعرے والے اسے جو کچھ دیتے، اسے مٹھی میں دبا کر باہر نکل آتا۔ انار کلی میں صوفی ڈاکٹر حبیب الرحمٰن برق رحمۃ اللہ علیہ کا آستانہ اس کی بے چین راتوں کا واحد آسرا تھا۔ شہر کی اکثر لانڈریوں میں اس کے کپڑے تھے، تن کا جوڑا میلا ہو جاتا تو کسی لانڈری میں گھس جاتا۔ میلا اتار کر دھلا ہوا جوڑا پہن کر باہر آتا تو دنیا اُسے اپنی طرف کھینچ رہی ہوتی اور اس کے باطنی خلاء کی وسعتیں الگ اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ رہی ہوتیں۔ جاننے والوں نے اسے فلمی گیت لکھنے، فلمیں بنانے اور اخبار رسالے نکالنے کی کشمکش میں بھی پھنسایا، اس کے لکھے ہوئے فلمی گیتوں نے ابھرتی ہوئی فلمی صنعت کے استحکام میں بڑی مدد دی۔ اس سے جتنے پیسے ملے، اس نے چند دنوں میں ضائع کر دیئے۔ کسی نے کہا، رہنے کے لئے کوئی کمرہ کرائے پر لے لو۔ کمرہ لیا تو یہ سوچ کر چھوڑ دیا کہ کون اس کی دیکھ بھال کرے گا، ہفت روزہ تصوّر کا ایڈیٹر بنا تو اسے ایڈیٹر کی کرسی پسند نہ آئی۔ ایک دوست نے اسے ذاتی اخبار کا ڈیکلریشن لے دیا تو چند ایک شمارے نکال کر اس نے پانچ روپے میں ڈیکلریشن فروخت کر دیا، لوگ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور انہیں ساغر کی ذہنی صحت کے بارے میں جو شبہ تھا، یقین میں بدل گیا۔ ساغر نے بھی اس کی وضاحت ضروری نہ سمجھی اور اس مسئلے پر اس سے بات چیت کی جاتی تو وہ پُر ملال ہنسی سے یہ کہہ کر موضوع بدل دیتا کہ کوئی اور بات کرو۔ کون جانتا ہے کہ خیال کی حفاظت کرنا کتنا عظیم فرض ہے۔ درحقیقت وہ شعوری طور پر اخفاء سے کام لے رہا تھا۔ اور اس کا ثبوت یہ شعر ہے۔

تیری محفل کا بھرم رکھتے ہیں سو جاتے ہیں ۔۔۔ ورنہ یہ لوگ تو بیدار نظر آتے ہیں

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس نے باطنی خلاء کو پُر کرنے کے لئے اپنے آپ کو خود اختیاری مدہوشی کے سپرد کر دیا تھا۔ اگر وہ خود اختیاری مدہوشی اختیار نہ کرتا تو یقیناً ریزہ ریزہ ہو جاتا کیونکہ اس پہ جو وارداتیں گذر رہی تھیں، ان کا برداشت کرنا شہادت گہ مرداں ہے کیونکہ صوفی برق رحمتہ اللہ علیہ کے آستانے سے وابستگی نے ساغر کے خیالوں کی پرواز کی سمت درست کر دی تھی۔ اور وہ خیال کی حقیقت سے آشنا ہونے لگا تھا ان دنوں وہ عالمِ مدہوشی میں کہا کرتا تھا!

"خیال خدا ہے۔ خدا خیال ہے اور زندگی ایک حسین لیٹرا ہے"

اب زندگی کے حسین لیٹرے سے اپنے خیال کی دولت کو بچانے کی طاقت حاصل کرنے کا مرحلہ باقی تھا۔

ساغر نے شعور کے حوالے سے جان لیا تھا کہ اس کی تخلیق کا مقصد ایک خالص صوفیانہ تجربے سے گذرنا ہے جو پیدائش کے وقت ہی اس کی روح میں مشیتِ ایزدی نے چھپا دیا تھا۔ اور وہ جن نگاہوں سے دنیا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دنیا والوں کی نگاہوں سے مختلف تھی اور پھر صوفی برق رحمتہ اللہ علیہ کی پُر شفقت توجہ نے ساغر کو وسوسوں اور اندیشوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔ رفتہ رفتہ خود اختیاری مدہوشی کے مسلسل عمل نے اسے ایک مستقل مدہوشی کے مرحلے میں پہنچا دیا جس کے مقابلے میں خود اختیاری مدہوشی بے معنی ہو کر رہ گئی ظاہری حواس کی بجائے وجدان سے راہنمائی حاصل کرنے کا پروسس بھی کم جانگسل نہیں، کیونکہ اس کے لئے ظاہری حواس سے نجات حاصل کرنا ناگزیر ہے اور ساغر کی وجدانی سوچوں کے آغاز کا بھی یہی وہ مقام ہے جہاں سے ساغر معاشرتی، سماجی اور رائج الوقت رسم و رواج کو مسترد کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

میں اس کی اس حالت کا عینی شاہد ہوں جو ایک طویل عرصے پر محیط ہے۔ اور جس باطنی خلاء نے اسے مضطرب، پریشان اور پُر الم رکھا ہوا تھا اسے پُر کرنے کے لئے وہ غیر شعوری طور پر صوفیائے کرام سے اکتسابِ نور کر رہا تھا۔ اور ایک ان دیکھی قوت جس سے آشنا ہونے کے لئے ساغر دیوانہ وار آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا جو اسے فنائے صفت کے مرحلے پر لے آئی تھی۔ ساغر کی خوبصورت آنکھیں ویرانوں میں تبدیل ہو گئی تھیں اس کے سیاہ گھنگھریالے بال راکھ، خاک اور گرد و غبار سے آلودہ ہو کر لٹوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اس کا جسم چل کر بوسیدہ چیتھڑوں میں لپٹ کر رہ گیا تھا۔ اس کے پیروں پر مٹی اور دھول جم کر سیاہی مائل ہو گئی تھی۔ فنا کے ابتدائی سفر کا کچھ حصہ اس نے داتا حضورؒ کے قرب و جوار میں بسر کیا، داتا حضورؒ کے مزار مبارک کے سرہانے نم آلود اور تاریک کوٹھڑیاں تھیں، جہاں ساغر کا ٹھکانا تھا وہ کسی کو نہیں پہچانتا تھا۔ وہ تو اپنے آپ کو بھول گیا تھا کس کس کو یاد رکھتا۔

میں کبھی کبھی اس طرف سے گذرتا اور ساغر کو دیکھنے کے لئے ان تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں جھانکتا تو بوسیدہ دیواروں سے لپٹے ہوئے سائیوں میں ساغر کا سایہ دیکھ کر لرز اٹھتا۔ میں اسے آواز دیتا اور وہ نیم وا آنکھوں سے دیکھ کر پھر کہیں کھو جاتا۔ ان کوٹھڑیوں کے مقیم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔
وہ اسے مجھ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر حیران ہو جاتے۔ ساغر کی باتیں سمجھنے کے لئے مجھے بہت غور کرنا پڑتا اس کی باتوں میں ربط نہیں رہا تھا۔ اکثر وہ بڑبڑا کر کوٹھڑی کی سیاہ چھت کو گھور کر عجیب و غریب اشارے کرتا اور پھر دلگیر ہو کر کہتا "اللہ ہی وارث ہے"۔

فنا کے اس انوکھے اور حیرت انگیز تجربے کے ابتدائی مرحلے میں جب اس کے حواس ابھی پوری طرح معطل نہیں ہوئے تھے اس نے اپنی دگرگوں حالت اور اندرونی کشمکش کا اظہار بعض شعروں میں بھی کیا تھا کہ اس پر دنیا کی منافقت، جھوٹ اور فریب آشکار ہو گیا ہے اور وہ اپنے وجدان کو بچانے کے لئے اپنی ذات، انفرادیت اور انا کی قربانی دینے کے لئے بالکل تیار ہے۔ ظہیر کاشمیری بتاتے ہیں کہ ایک رات وہ میکلوڈ روڈ کے سابق مانسرور ہوٹل کے ایک کمرے سے باہر نکل رہے تھے کہ انہیں دروازے کے پاس ہی ساغر دکھائی دیا جو ایک بوسیدہ کمبل لپیٹے چپ چاپ پڑا تھا۔ ظہیر کاشمیری نے پوچھا۔ ساغر یہاں کیا کر رہے ہو؟

ساغر نے کمبل کو چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا "خیال کی حفاظت کر رہا ہوں"۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کے رسم و رواج کے مطابق وہ بزدل، کمزور اور شکست خوردہ فرد تھا۔ لیکن باطنی طور پر کتنا تندرست اور توانا تھا کہ وہ حسن و خیر، پاکیزگی خیال اور ایک لازوال روشنی کی دولت سے مالا مال ہونے کے لئے فنا کے صحراؤں میں بہادروں کی طرح داخل ہوا۔ وہ سڑکوں پر چل رہا ہوتا تو اسے کئی ناصح مل جاتے اس کی حالت زار پر ترس کھا کر اسے مشورہ دیتے، جھوٹی سفید پوشی اور دنیا پرستی کے اصولوں کی روشنی میں وعظ کرنے لگتے، کچھ اس کی شاعری کے حوالے سے اسے روک کر عزت و احترام کا نذرانہ بھی پیش کرتے۔ اور ساتھ یہ پوچھتے کہ اس نے یہ حالت کیا بنا رکھی ہے۔ کپڑوں پیسوں اور رہائش گاہوں کی پیش کش بھی کی جاتی کہ ساغر نارمل افراد کی طرح معاشرے میں اپنا کردار کیوں نہیں ادا کرتا۔ وہ سب کی سنتا اور چپ رہتا سرکلر روڈ پر میرے ساتھ چلتے ہوئے اس نے بارہا یہ کہا تھا

"یہ لوگ فقیر کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں، اور میں انہیں کیسے بتاؤں کہ میں تو اپنی ذات کی سولی پر

لٹکا ہوا ہوں اور یہ تو خود اندھے ہیں۔ مجھے کیا راستہ بتائیں گے"۔

ایک سچے تخلیق کار کے لیئے یہ پروسس اور بھی اندوہناک ہو جاتا ہے۔ جب وہ آخری صداقت کو علم کے حوالے کی بجائے اپنے وجدان سے شناخت کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور یہ تجربہ بھی کم پُر الم نہیں جب صداقت کو بیان کرنے کے لئے مشاہدہ ضروری ہو جائے۔ اور ساغر کا یہ تجربہ سراسر صوفیانہ طرزِ عمل کا حامل ہے جس میں اس نے حقیقتِ اُلوہی سے تعلق استوار کرنے پر اسرارِ کائنات اور زندگی کی حقیقت تک رسائی کے لئے وہی راستہ اختیار کیا جو صوفیائے کرام کے نقش پا سے منور ہے۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں لکھا ہے کہ ساغر کی گردش حیرتوں سے شروع ہوئی۔ تصوّف میں حیرت اُلوہی حقیقت تک رسائی کا نکتۂ آغاز ہے کیونکہ صوفیانہ تعلیمات کی رُو سے حیرت صرف ان خوش نصیب افراد کے حصے میں آتی ہے، جن کی روحوں کو حقیقت اُلوہی کی آگاہی اور اس کے شعور کے لئے منتخب کیا جاتا ہے۔ اور ساغر بھی ایک ایسی ہی خوش نصیب روح کا مادی لباس تھا۔

جب ساغر پوری طرح جاننے والوں کے لئے زمین سے محو ہو گیا اور لوگ اسے بھول گئے تو صرف اس کی غزلوں کی صدائے بازگشت علمی ادبی حلقوں میں گونجتی رہی، ساغر خود فراموشی کی آخری منزلوں پر تھا۔ اس کے ناخن اتنے بڑھ گئے کہ غیر ارادی طور پر میل میں چھپے جسم کے کسی حصے کو کھجلاتا تو وہاں زخم بن جاتے اسے نہانا یاد ہی نہیں تھا اور اس کے رسیوں میں تبدیل ہونے والے بالوں میں جوئیں پڑ گئی تھیں۔ اسے کسی نے کچھ کھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس نے باتیں کرنا بھی بالکل ترک کر دیا تھا اور یوں لگتا تھا۔ جیسے زمانے بھر کی ملامت اس نے اپنی جھولی میں سمیٹ لی ہے۔

ساغر کی زندگی پہ کوئی تبصرہ نہ کر
اک شمع جل رہی ہے سرِ رہگذارِ زیست

اس رہزنِ حیات زمانے سے دُور چل
مر بھی گئے تو چادرِ صحرا بری نہیں

پا برہنہ رہِ حیات میں ہم
چل رہے ہیں گلہ نہیں کرتے

اسی قسم کے بے شمار شعر اس کی غزلوں میں موجود ہیں، جو اس کی فنا کے تجربے کے رازدار ہیں،

ایک ایسا وقت بھی آیا کہ اس پہ بلاؤں کی انتہا ہو گئی۔ اس کا سارا جسم پیپ اور خون سے بھرے ہوئے زخم میں تبدیل ہو گیا اور اسے داتا حضور رح کے مزار شریف کے پیچھے کھڑ کھڑی پیر کے احاطے میں دیکھ کر میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔ مرے ساتھ فوٹو گرافر حفیظ قندھاری بھی تھا اور ہم نے اسے بڑی مشکل سے اپنی طرف متوجہ کیا لیکن وہ ہمیں پہچان نہ سکا۔ اجنبیوں کی طرح باتیں کرتا رہا جن میں کوئی ربط نہیں تھا۔

میں ٹوٹا ہوا تارہ دیکھ رہا ہوں۔

میں کون ہوں اور توں کون ہے۔

سائے پھیل رہے ہیں۔ احساس ریزہ ریزہ ہے۔ لال ٹوپیوں والے آئیں گے اور نیزوں پر سروں کو سجائیں گے۔

کچھ فقرے اس کے ہونٹوں تک آنے سے پہلے ہی غائب ہو گئے اور وہ اپنے زخم زخم جسم کو گھسیٹ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اس نے اپنے چہرے پر گندی بوسیدہ بوری ڈال دی جو اس کا بستر تھی۔

حفیظ قندھاری کا خیال تھا کہ ساغر اب نہیں بچ سکتا۔ میں نے مشورہ دیا کہ کل اسے یہاں سے اٹھا کر ہسپتال لے جائیں گے۔ دوسرے دن ہم وہاں گئے تو ساغر غائب تھا۔ آس پاس سے دریافت کیا تو سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ چند دنوں بعد ساغر کے ایک نیم مجذوب اور نیم ہوش مند واقف کار شبیر بجلی والا نے بتایا کہ ساغر رحم سائیں کے تکیئے میں ہے۔

رحم سائیں کا تکیہ ٹکسالی دروازہ کے باہر دریام شالہ کے پاس تھا جہاں قیام پاکستان سے قبل ہندو اپنے مردے جلایا کرتے تھے۔ حفیظ قندھاری ان دنوں لیل و نہار میں کام کرتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ وہ ساغر کی اس حالت کی تصویریں بنائے گا اور لیل و نہار میں فیچر شائع کریں گے۔ لیکن میرا مقصد صرف ساغر کا مشاہدہ کرنا تھا۔ ہم اتوار کی ایک صبح رحم سائیں کے تکیئے پر پہنچے تو معلوم ہوا ساغر ابھی ابھی کہیں گیا ہے۔ رحم سائیں نے ایک چٹائی بچھا دی اور کہا، انتظار کریں۔ شاید حضرت صاحب آ جائیں۔

رحم سائیں کے منہ سے ساغر کے بارے میں حضرت صاحب کے الفاظ سن کر مجھے خاص طور پر بڑی حیرت ہوئی کہ ساغر میں اس حالت میں کون سی ایسی خوبی پائی جاتی ہے کہ رحم سائیں اسے قابلِ احترام سمجھ رہا ہے۔ رحم سائیں نے ہمارے لیے چائے منگوائی اور ساغر کے بارے میں گفتگو کرنے لگا۔ رحم سائیں نے ساغر کو جس عالم میں دیکھا تھا۔ اس کی وضاحت کے لیے اس کے پاس لفظ نہیں تھے لیکن اس بات پر بڑا خوش تھا کہ ساغر اس

کے پاس آگیا ہے۔ دوپہر تک انتظار کرنے کے بعد ہم واپس آگئے کیونکہ ساغر کا دُور و نزدیک تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ تین چار دن کے وقفے کے بعد دوبارہ رحم سائیں کے تکیئے پر گئے تو کسی نے بتایا شاہدرہ میں مقبرہ جہانگیر کی بیرونی دیوار کے پیچھے ایک ڈیرہ ہے ساغر آج کل وہاں ہے۔

یہ جگہ تلاش کرنا واقعی مشکل تھا اور پھر میں بھی زندگی کے سنگین مسائل میں الجھا ہوا تھا اس لئے دو سال تک ساغر سے کہیں بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ البتہ شبیر بجلی والا اسے کہیں نہ کہیں ضرور مل جاتا اور اس کی زبانی معلوم ہوتا کہ ساغر عجیب و غریب منزلوں پر ہے۔ شبیر بجلی والا جس نے اس دور میں ساغر کے ساتھ کئی راتیں بسر کی تھیں ساغر ہی کے لہجے میں گفتگو کرنے کا عادی ہو گیا تھا اور وہ بتاتا تھا کہ ساغر خیالوں سے پرے کی دنیا میں ہے اور خود فراموشی میں ایسے انکشافات کرتا ہے کہ سمجھ سے بالاتر ہیں۔ شبیر روزانہ سگریٹ اور کھانا وغیرہ لے کر شاہ عالمی سے کبھی شاہدرے اور کبھی رحم سائیں کے تکیئے میں جاتا اور گھنٹوں اس کی باتیں سنتا رہتا، ایک شام وہ مجھے بھی اپنے ساتھ اس بھروسے پر لے گیا کہ ساغر سے ضرور ملاقات ہو جائے گی لیکن وہی ہوا، ساغر پھر غائب تھا اور میں اس کی وہ باتیں سننے سے محروم ہو گیا جو شبیر کے نزدیک انکشافات تھیں،

کچھ عرصہ بعد میں اور اکرام لدھیانوی بھاٹی دروازہ کے باہر کھڑے تھے کہ اچانک ساغر ہمارے قریب آگیا اس کے نحیف و نزار جسم سے چمٹے ہوئے کپڑے تار تار ہو رہے تھے اور اس نے پہلے تو ہم دونوں کو بڑے غور سے دیکھا اور پھر بڑبڑا کر جانے ہی والا تھا کہ دوبارہ ٹھہر گیا، میں نے کہا۔

"کیا حال ہیں ساغر۔ ملتے ہی نہیں

اس نے میرے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور کہا۔

"ایک چونی کا سوال ہے۔ فقیر کو چونی دو"

اکرام نے کہا،" ذرا ٹھہرو۔ اور چلو کہیں چائے پیتے ہیں چونی بھی مل جائے گی"

اس نے اکرام کی طرف پُراسرار نظروں سے دیکھا اور یہ کہکر بھاٹی گیٹ کے ہجوم میں گم ہو گیا کہ "فقیر کے پاس وقت نہیں، ڈیوٹی بڑی سخت ہے"

ہم کافی دیر تک ساغر کی باتیں کرتے رہے اور اس بات پر اطمینان سا ضرور ہوا کہ اس کے جسم کے زخم ٹھیک ہو چکے تھے اور وہ قدرے ہوش میں تھا۔ اب اس کا مستقل ٹھکانہ رحم سائیں کا تکیہ تھا جہاں اس نے ایک کوٹھڑی میں ڈیرہ جمالیا تھا۔ صبح ہی صبح وہاں سے چل دیتا۔ شہر کے مختلف حصوں کا چکر

لگاتا، ملنے جلنے والوں سے چونیاں طلب کرتا اور دوبارہ اس کوٹھڑی میں چلا جاتا۔ اب شہر میں لوگوں نے اسے چونیاں مانگتے ہوئے دیکھا تو پھر وہی باتیں شروع ہو گئیں کہ خود فراموشی ہی کے باعث وہ بھکاری بن گیا ہے۔ اچھا بھلا شاعر تھا۔ اگر شاعری ہی پر انحصار کرتا تو کسی مرتبے پر ہوتا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ شعر کہنا بھول ہی گیا تھا۔ چونی دینے والے شعر کی فرمائش کرتے تو وہ دامن طلب جھٹک کر آگے بڑھ جاتا، اس کے ساتھ عجیب وغریب لوگ ہوتے تھے۔ پھٹے پرانے کپڑوں والے درماندہ لوگ، جہاں وہ رک جاتا وہ بھی رک جاتے اور اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہتے۔

ایک دن ساغر مجھے نگار سینما کے سامنے والے فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا مل گیا اور مجھے دیکھ کر اس نے پھٹی پرانی چادر جسم سے ہٹائی اور فٹ پاتھ صاف کر کے بولا

"بیٹھ جاؤ۔ تمہیں سگریٹ پلاتے ہیں" میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک مجذوب قسم کا شخص سگریٹ لے کر آیا اور پاس ہی بیٹھ کر ساغر کے پیر دبانے لگا۔ میں نے ساغر کے پیروں کو غور سے دیکھا تو مٹی اور خاک سے ان کی رنگت سیاہ ہو چکی تھی۔ ایڑیاں پھٹی ہوئی تھیں۔ اور میل بھرے ناخن بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے۔ میں نے پھر پوچھا۔

کیسا حال ہے، اس نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

"پوچھو نہیں، دیکھو کہ فقیر کس حال میں ہے۔ باقی اللہ وارث ہے اور نہیں جانتا کہ سفر کہاں ختم ہوگا"

ساغر کا سفر جاری تھا اور اب وہ شہر میں عام دکھائی دینے لگا تھا کبھی بہت سنجیدہ، کبھی ہوش میں اور کبھی خود سے اتنا بیگانہ کہ بات تک نہ کرتا۔ باتیں کرتا تو ہوش والے حیران رہ جاتے۔ اب اس نے رحم سائیں کے تکیئے میں بھی جانا چھوڑ دیا تھا۔ کبھی رات صوفی برق رحمتہ اللہ علیہ کے آستانے پہ بسر کرتا۔ کبھی شاہ عالمی میں ایک متروکہ عمارت کی سیڑھیوں میں آ کر بیٹھ جاتا اور صبح ہوتے ہی کہیں نکل جاتا، سارا دن شہر کی سڑکوں، چوراہوں اور بازاروں کی خاک چھانتا ہوا لوہاری آ جاتا۔ کبھی کسی کے پاس کھڑا ہو جاتا اور کبھی کسی سے باتیں کرنے لگتا۔ سننے والے یہ یقین لے کر اس سے جدا ہوتے تھے کہ وہ سب کچھ بھول گئے ہیں لیکن دل میں اس بات کا نہیں دکھ بھی تھا کہ کتنا اچھا شاعر اس معاشرے میں حالات کے ہاتھوں تباہ ہو گیا ہے۔ اگر اسے معاشی تحفظ دیا جاتا تو یقیناً علم وادب کے فروغ میں گراں قدر خدمات سرانجام دیتا۔ شہر گردی کے دوران ساغر کو یہ فقرے عموماً سنائی دیتے اور وہ صرف سر ہلا کر آگے بڑھ جاتا۔ کئی سال

تک اپنے آپ سے بے خبر رہنے کے بعد ساغر لوگوں کے درمیان واپس آیا تو اتنا دامن دریدہ تھا کہ اجنبی اسے بھکاری سے زیادہ درجہ دینے کے لئے تیار نہ تھے، اور وہ بھی شاید دامن پھیلا کر شہر والوں کے لئے آزمائش بن گیا تھا، میں نے اکثر لوگوں کو دیکھا جن میں اس کے جاننے والے بھی ہوتے تھے۔ اس کی تباہ حالی کا منظر تک دیکھنا گوارا نہ کرتے تھے اور اس کا سامنا اس لیے نہ کرتے تھے کہ ساغر کہیں ان سے کچھ طلب نہ کرلے۔ حالانکہ ساغر کی طلب کی انتہا یہ تھی کہ اگر کوئی پھوٹی نہ بھی دیتا تو وہ دعا دے کر آگے بڑھ جاتا، ساغر نے اپنی اس حالت پر ایک دفعہ کہا تھا کہ شاید ہی کسی سے اتنی بھیک منگوائی گئی ہو، اس حالت میں اسے صرف اتنا ہی ہوش تھا کہ وہ بھیک مانگ رہا تھا: جونہی اس کے پاس چائے اور سگرٹوں کے لئے پیسے ہوجاتے وہ شہر سے نکل جاتا۔ لیکن کبھی کبھی اس پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوجاتی کہ بڑبڑاتے بڑبڑاتے اس کے منہ سے جھاگ نکلنا شروع ہوجاتی۔ وہ زخمی پیروں کی تکلیف سے بے پرواہ تیز تیز چلتا ہوا لوگوں میں سے گذر جاتا، پھر یونہی رک کر پیچھے کی طرف دیکھتا جیسے باتیں کر رہا ہو اور اس کے بعد سخت غصے اور رنج کے دباؤ کے تحت چلا جاتا۔ کسی ویران باغ میں یا شہر کی فصیل کے ساتھ ساتھ بہنے والے گندے نالے پر آجاتا، چند دنوں بعد اس پر سے یہ کیفیت بھی گذر جاتی اور وہ اتنا خاموش ہوجاتا جیسے بہت ہی گہرا سمندر ہو۔ ایک دفعہ اسی عالم میں وہ سرکلر روڈ کے فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا مل گیا، یہ گرمیوں کی ایک شام کا ذکر ہے، فٹ پاتھ کے اس حصے پر ایک بلڈنگ کا سایہ تھا اور وہ سر نہوڑائے اس طرح بیٹھا تھا جیسے کوئی گتھی سلجھا رہا ہو، میں اس کے قریب جاکر کھڑا ہوا تو اس نے مجھے گہری سرخ آنکھوں سے دیکھا اور اس طرح سر ہلایا جیسے اس نے مجھے پہچان لیا ہو۔ اس نے اشارے سے بیٹھنے کے لئے کہا اور مجھے چند سکے دے کر کہنے لگا۔

"انہیں گن دو"

"تم خود کیوں نہیں گن لیتے۔"

ساغر نے سگریٹ کے ٹکڑے کو انگلیوں سے مسلتے ہوئے کہا

"فقیر گنتی بھول گیا ہے۔ اور یہ بھی اچھا ہوا کہ حساب دینے سے بچ جاؤں گا"

میں نے سکے گنے تو کل ایک روپیہ سات آنے تھے، میں نے اسے اس کے ہاتھ میں پیسے پکڑائے تو اس نے ہاتھ پرے کرکے کہا۔

"رکھ دو!"

ایک روپیہ سات آنے اس کے سامنے بکھرے تھے اور مجھے ایک تباہ حال شخص کے پاس پنجوں کے بل بیٹھے ہوئے دیکھ کر اور بھی کچھ لوگ کھڑے ہو گئے۔ ساغر اپنے آپ سے ہی دھیمے لہجے میں مخاطب تھا۔ لیمپ کے سگرٹوں کے کئی ٹوٹے اس کے پاس بکھرے پڑے تھے۔ ساغر نے اچانک لوگوں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ تم کیا دیکھتے ہو، اس کے بعد اس نے سیاہ میلی چادر اپنے سینے سے ہٹائی اور ہڈیوں بھرا سینہ دکھاتے ہوئے بولا۔ "لو دیکھو۔ غور سے دیکھو۔ ایسا کسی کے ساتھ نہ ہوا ہوگا"۔

اچانک کسی راہگیر نے اس کے آگے بکھرے ہوئے سکوں میں ایک چونی پھینکی اور ساغر نے فوراً یہ چونی اٹھا کر راہگیر کی طرف پھینک دی اور کہا

"فقیر پر اپنی خدا ترسی کا اثر نہ ڈالو۔ میں فقیر ہوں بھکاری نہیں"۔

بہت دنوں بعد ساغر کو میں نے ایک پُر سکون حالت میں دیکھا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ اس سے باتیں کروں۔ لیکن وہ باتیں کرنے کے بھی موڈ میں نہیں تھا۔ جب میرے سوال بڑھتے گئے تو اس نے سکے مٹھی میں پکڑے اور بھاٹی دروازے کی طرف چل دیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا اور چوک میں جا کر کہنے لگا۔" اب جاؤ۔ فقیر اپنی منزل کی طرف جا رہا ہے"۔

منزل ساغر کی باتوں میں کثرت سے استعمال ہونے والا ایک ایسا لفظ تھا جسے وہ اپنے ہی معنوں میں استعمال کرتا تھا۔ اب وہ دوسرے تیسرے دن مل جاتا اور دوسرے لوگ نہ ہوتے تو کہتا۔

" بابا۔ بڑی آزمائش ہے۔ پر اللہ ہی وارث ہے۔ اندر جھانکتا ہوں تو خالی نظر آتا ہے اور پتہ نہیں منزل کون سی ہے ہاں۔ درد خود دوا بھی بن جاتا ہے۔ لیکن اپنے آپ کو ملیامیٹ کرنا پڑتا ہے"۔

رحم سائیں کے تکیئے کی منزل سے گذر کر وہ شہر کی منزل میں آیا تو گرمیاں تھیں۔ سرد ہوائیں چلنے لگیں تو اس کے پاس براؤن رنگ کا ایک کمبل آ گیا۔ کمبل پا کر وہ بہت خوش تھا اور اس کے ایک پرانے جاننے والے نثار ڈرائیور نے اسے پیشکش کی کہ وہ اس کے شاہ عالمی میں واقع گھر میں آ جائے، جہاں اُسے سونے کے لئے جگہ، وقت پر کھانا اور چائے ملے گی۔ ساغر کئی دنوں تک اسے ٹالتا رہا اور پھر ایک روز نثار زبردستی اسے گھر میں لے گیا لیکن ایک مہینے سے پہلے ہی ساغر نے یہ گھر چھوڑ دیا اور کہا "میں قیدی نہیں ہونا چاہتا۔ وقت پر کھانا قیدی بھی کھا لیتے ہیں اور فقیر کی خوراک ہی گتنی ہے کہ خود کو روٹی کے حوالے کر دے"۔

اب وہ تیزی سے ہوش کی دنیا میں آ رہا تھا۔ اس نے اخبار مارکیٹ میں قیام کر لیا تھا۔ اخبار فروش اس کی بڑی دیکھ بھال کرتے تھے اور وہ گرد و پیش کے حالات کو بھی دیکھنے اور سمجھنے لگا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ذات کی فنا کے پروسس سے گذر کر بحالیٔ ہوش کی منزل میں آ رہا تھا۔ جاننے والے اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے لگے تھے۔

شام کو میرے علاوہ اخبار مارکیٹ میں اور بھی دوست آ جاتے۔ چائے کا دور چلتا۔ باتیں ہوتیں، شاعر شعر سناتے۔ اگر ساغر سے فرمائش کی جاتی تو کہتا "سنائیں گے ضرور سنائیں گے"

لیکن قیام اسے بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اخبار مارکیٹ کی معرفت اس کو تلاش کر لیا جاتا تھا، ایک والہانہ آوارگی کی زنجیر اس کے پیروں میں تھی لیکن وہ شام کو گھوم پھر کر اخبار مارکیٹ میں ضرور آ جاتا۔ ۱۹۵۸ء میں ایوب خاں نے حکومت سنبھالی تو ساغر خاصا ہوش مند تھا لیکن اچانک دوبارہ بیمار ہو گیا اور اخبار مارکیٹ والوں نے اس کے لئے عطیات کی اپیل کی تو وہ سخت برہم ہو گیا اور بیماری کی حالت میں ہی اخبار مارکیٹ سے نکل گیا۔ جہاں ملتا۔ اخبار مارکیٹ والوں کی شکایت کرتا کہ انہوں نے اپیل کر کے فقیر کو رسوا کر دیا ہے، عام خیال تھا کہ ساغر اس بیماری سے نہ بچ سکے گا لیکن وہ حیرت انگیز طور پر صحت یاب ہو گیا۔ اس جسمانی صحت کے بعد اس کی زندگی میں وہ انقلاب رونما ہوا جس کے لئے اسے آزمائش کی دہکتی ہوئی آگ سے گذرنا پڑا تھا۔ کائنات کی یہ حقیقت اس پر منکشف ہو گئی تھی کہ حسن، نیکی اور سچائی کا منبع صرف اور صرف خالقِ کائنات ہے اور انسان اس کی اعلیٰ ترین مخلوق ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی سروری و حاکمیت کا ایک ایسا مظہر ہے جس کو یہ شرف بخشا گیا ہے کہ وہ کائنات کے بحرِ بیکراں سے نکل کر اس سے وابستگی اختیار کر کے ہی انسانیت کی تکمیل کا فرض ادا کر سکتا ہے اور یہ محسوسات کی دنیا ایک عالمِ فریب ہے اور اس سے نکل جانا ہی اصلِ حیات ہے۔

ساغر اپنی بصیرت اور اپنے عقل و حواس سمیت ہوش کی حالت میں واپس آیا تو اس مخفی تجربے کی سرشاری کا پیکر تھا جسے اس نے اپنی ذات اپنی انفرادیت اور اپنے وجود کی نفی کے عمل سے حاصل کیا تھا۔ اسے نہ شہرت کی تمنا تھی اور نہ کسی آسائش کی، سارا جہاں اس کا گھر تھا اور شہر لاہور کا ہر فٹ پاتھ اس کی مملکت تھی۔ اپنی راتوں اور اپنی صبحوں کا آپ مالک تھا۔ وہ ہر قسم کی بھوک سے بے نیاز تھا۔ وہ ہر ملنے والے کے لئے سراپا دعا بن گیا۔ جہاں بیٹھ جاتا لوگ عقیدت سے اس کے

گرد جمع ہو جاتے اور جب وہ دیکھتا کہ اس کا راز افشا ہونے والا ہے تو وہ شعوری طور پر لوگوں کی عقیدت کے آبگینے توڑ دیتا۔ اس نے اپنا بھید چھپانے کے لئے سیاہ چادروں کا ملبوس بنوایا اور جب کوئی پوچھتا "ساغر صاحب آپ نے سیاہ لباس کیوں پہنا ہے" تو وہ ہنس کر جواب دیتا۔ "بابا" "یہ فقیر کا لباسِ غم ہے"

ساغر کی ہوش و حواس کی دنیا میں واپسی ایک خالص صوفیانہ نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان خوش نصیب روحوں کو جو اس کے قرب کے لئے بے چین رہتی ہیں اور صرف اس کے لئے ہر اس چیز سے دستبردار ہو جاتی ہیں جو ان سے طلب کی جاتی ہے۔ جب وہ اس امتحان میں کامیاب ہوتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اس روح کو سکون کی لازوال دولت بخش دیتا ہے۔ ساغر کی واپسی اس کی بے چینیوں کا خاتمہ بن گئی اور وہ اطمینان اور سکون کے پُر کیف بادلوں میں رہتا۔ ساغر کا شعور اور وجدان پہلے سے بھی زیادہ نکھر گیا تھا۔ وہ گرد و پیش پر گہری نظر رکھتا۔ بھٹک جانے والوں پر ترس کھاتا، گمراہی اور غفلت میں تباہ ہو جانے والوں کا ماتم کرتا اور اپنی وجدانی سوچوں کو بڑی تیزی سے اشعار کے پیکر میں ڈھالنے لگا۔ دنیا کی ہوس تو پہلے بھی اس کے پاس نہ تھی اور حقیقت اُلوہی سے آشنائی نے ساری کائنات کو اس کا ورثہ بنا دیا تھا۔ لیکن اس کے رہن سہن میں کوئی فرق نہ آیا، وہی فٹ پاتھ وہی ویران باغ اور وہی راستے اس کے ساتھی تھے۔ سردیوں میں جو بستر اور کمبل وغیرہ خریدتا اسے گرمیاں شروع ہوتے ہی فروخت کر دیتا۔ اخبار مارکیٹ، انار کلی کا درزی خانہ، شاہ عالمی کے باغ اور داتا حضورؒ کے آس پاس کے فٹ پاتھ اس کی بہترین رہائش گاہ تھے۔ وہ جہاں ہوتا ملنے والے وہیں آ جاتے۔ شعر و شاعری ہوتی خیالات کا تبادلہ ہوتا اور ساغر اپنے نکتہ نظر سے باتیں کر رہا ہوتا تو یوں لگتا جیسے وہ افکار و خیال کی انتہائی بلندیوں پر ہو۔ لیکن اس کے لب و لہجہ میں غرور اور تمکنت نام کو نہ تھی۔ عاجزی اور انکساری نے اسے سراپا حسن بنا دیا تھا۔ اور اس کے شعروں نے ایک بار پھر ان لوگوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا جو اس کی طبعی موت کی پیشنگوئیاں کر چکے تھے۔ ساغر جسے میں نے حالتِ فنا سے پہلے اور حالتِ فنا کے بعد بڑے قریب سے دیکھا۔ میرے عقیدے کے مطابق اس پر جو کچھ بیتی وہ اس کا خود اختیاری فعل نہیں تھا بلکہ ایک ان دیکھی قوت دوستوں اور مہربانوں کی طرح اسے اس راہ پر لے آئی تھی اور راہنما بن کر قدم قدم پر اس کا پُر شفقت سہارا بنی رہی۔ پُر الم گھڑیوں میں تسکین کا سامان بن گئی اور انکشافِ حقیقت کے نازک لمحوں میں خود اس کا ظرف بن گئی۔

بحالی ہوش کے بعد ساغر کی شاعری میں وہی وسعت اور گہرائی پیدا ہو گئی جو ہر اس آرٹ ادب

اور فن کو ابدیت بخشی ہے جو صوفیانہ اندازِ فکر کے سانچے میں تخلیق ہوتا ہے۔ اس کی غزلوں میں جہاں اس کے روحانی تجربوں کی جھلکیاں ملتی ہیں، وہاں وہ معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی مسائل پر بھی بے باکی سے تبصرہ کرتا ہوا نظر آتا ہے، وہ دکھی انسانیت پر تڑپ تڑپ اٹھتا تھا۔ قومی تنزل اور اخلاقی پستی پر کبھی کبھی اتنا دلگیر ہوتا کہ اس کی روح کا کرب دعا میں ڈھل جاتا۔ قومی سطح پر ہونے والے واقعہ پر اس کا شعری احساس اس قدر بیدار تھا کہ تباہ کن سیلابوں، جنگوں اور حادثوں پر اس شدت کے ساتھ شعر کہتا جیسے کسی سیلاب میں اس کا گھر تباہ ہو گیا ہو یا وہ خود میدانِ جنگ میں نبرد آزما ہو۔ اس کے علاوہ جس روحانی تجربے سے آشنا ہو کر اس نے کائنات کا بحرِ بیکراں عبور کیا تھا ایک مخفی دولت کی طرح اس کے سینے میں محفوظ تھا اور کبھی کبھی غیر شعوری طور پر اس کا اظہار شعروں میں بھی کر جاتا۔ حضور داتا صاحبؒ سے اسے بے انتہا عقیدت تھی اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے والہانہ عشق کا ثبوت اس کی نعتیں ہیں جو اس کی قلبی وارداتوں کا جمالیاتی عکس ہیں۔ دوسروں کے لئے یہ ایک ناقابلِ یقین حقیقت تھی کہ گمشدہ ساغر واپس آ گیا تھا۔ حقیقتِ الوہی کے جمال آفریں مشاہدے کے بعد وہ ایک ایسا ساغر تھا جس کے دامن میں حسن و خیر کے پھول تھے اور ایک باخبر مسافر کی طرح اپنی منزل سے پوری طرح آشنا تھا۔ اس کا اندرونی خلا حقیقتِ الوہی کے انکشاف سے پُر ہو گیا تھا۔ اب اسے کوئی تمنا بے چین نہ رکھتی تھی اور نہ کسی محرومی کا غم اسے پریشان رکھتا تھا، اس کے دُکھ اور سکھ کے تصور تبدیل ہو گئے تھے اس کی تنہائیوں کے شبستان الوہی چراغوں سے روشن تھے اور اس کا ہر شعر اس کے وجدانی تجربوں اور مشاہدوں کا ترجمان تھا۔ وہ ہر ملامت پر پہلے سے زیادہ مسرور ہوتا اور یہی وہ چیز تھی جسے اس نے موت کے آخری لمحوں تک سرشار رکھا، بے نیازی نے اسے اتنا پُرکشش بنا دیا تھا کہ لوگ پروانوں کی طرح اس کے گرد جمع رہتے جب ہجوم زیادہ ہو جاتا تو وہ اس طرح کنارہ کش ہو جاتا جیسے کسی سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ وہ لوگوں کے درمیان ہوتے بھی ان میں نہیں تھا اس نے پوری استقامت سے اپنا اندرونی حال سب سے چھپایا ہوا تھا۔ کبھی کبھی وہ حقیقتِ الوہی تک رسائی کے تجربے کی خود ہی بازگشت بن جاتا تو لرز اٹھتا اور گھنٹوں آسمان کی طرف اس طرح دیکھتا رہتا۔ جیسے ایک انتہائی عاجز اور بے بس انسان ربِ کائنات کے سامنے کھڑا ہو۔

"مجھے یاد ہے، کچھ دنیا دار قسم کے چالاک لوگ اس کی سادہ لوحی اور درویشی سے مطلب براری کے لئے اس کی خوشامدیں اور بے جا چاپلوسی کرنے لگے تو ان سے پیچھا چھڑانے کے لئے عجیب و غریب

حرکتیں کرنے لگتا۔ اپنے آپ کو اور تباہ حال بنالیتا اور کچھ عرصہ کے لئے ان مقامات سے غائب ہو جاتا جہاں وہ اکثر مل جایا کرتا تھا، وہ لوگوں کو یقین دلاتا کہ وہ صرف ایک شاعر ہے۔ اس نے اپنا بھید تو سب سے چھپائے رکھا لیکن اپنے تخلیقی عمل سے خود کو نہ چھپا سکا۔ جو اس کے روحانی تجربے سے قرارِ حیات تک کی مرحلوں کے گواہ بن گئے ہیں۔ اس نے شراب، میکدہ، ساقی اور بہار کی علامتوں کے ذریعے اپنی ہر کیفیت اور حالت کی عکاسی کی ہے اگرچہ یہ روائتی علامتیں ہیں اور صوفیانہ عمل کی مختلف حالتوں کے تجربے اپنی علامتوں کے ساتھ صوفی شعرا کے کلام میں موجود ہیں لیکن ساغر کے کلام میں یہ تجربہ اس کے تخلیقی حسن اور منفرد طرزِ اظہار کے ساتھ پوری طرح اُجاگر ہوتا ہے۔

ذات اور انفرادیت سے عاری ہونے سے پہلے جب ساغر کو ایک سچے عاشق کی تڑپ نے اپنی لپیٹ میں لیا اور وہ المناکیوں سے دوچار ہوا تو اس کا اظہار اس نے اس طرح کیا ہے۔

کچھ نہیں مدعا فقیروں کا
درد ہے لا دوا فقیروں کا

منزلوں کی خبر خدا جانے
عشق ہے رہنما فقیروں کا

تپتی رہی ہے آس کی کرنوں پہ زندگی
لمحے جدائیوں کے مہ و سال ہو گئے

اسرارِ کائنات میں گم ہونے کے لئے ساغر نے جو درد و الم اٹھائے اس کی شاعری کا بیشتر حصہ انہی غمناک وارداتوں پر مبنی ہے۔

میرے دامن میں شراروں کے سوا کچھ بھی نہیں
آپ پھولوں کے خریدار نظر آتے ہیں

دور تک کوئی ستارہ ہے نہ کوئی جگنو
مرگِ امید کے آثار نظر آتے ہیں

فغاں ہے درد ہے سوز و فراق و داغِ الم
ابھی تو گھر میں بہت مہربان بیٹھے ہیں

ساغر کے کلام کے تین حصے ہیں تو ایک حصہ حقیقت عوبی کی راہ میں خود کو گم کر دینے کے عمل کی عکاسی کرتا ہے۔ دوسرا اس کے ہوش و حواس میں واپس آنے کے بعد کے مرحلوں پر مشتمل ہے اور تیسرا جس میں وہ ایک صاحب ہوش مفکر کی طرح حقیقتوں سے پردے اٹھاتا ہے اور ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ان تینوں حالتوں میں ساغر کا تخلیقی شعور اپنے عمل سے بیگانہ نہیں رہا۔ اور قلبی اور ذہنی وارداتوں کے انتہائی نازک لمحوں کی عکاسی کے سلسلے میں اس طرح فن کے عروج پر نظر آتا ہے۔ جیسے فن اور الفاظ اس کے سامنے غلاموں کی طرح کھڑے ہوں۔

میں نے پلکوں سے درِ یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

مقصودِ حقیقی سے پر خلوص لگاؤ کا ساغر نے جس طرح ثبوت فراہم کیا ہے۔ ایک ایسے مقام کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں صرف مقصود ہوتا ہے۔ نہ تمنا رہتی ہے نہ آرزو، اور انسان دعاؤں کی منزل سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ بالکل بے مدعا ہو جاتا ہے اور پلکوں سے درِ یار پر دستک دینے کے مرحلے میں کیا باکمال خود سپردگی پائی جاتی ہے اور مقصودِ حقیقی کا ہو جانے میں ساغر جتنا سچا نظر آتا ہے کہ اس کی توقع ایک پابندِ وفا سے ہی کی جا سکتی ہے۔

خونِ دل شرط ہے اے یار بصیرت کے لئے
یہ بھی ممکن ہے کہ صحراؤں میں گلزار ملیں

ہر بھکاری پا نہیں سکتا مقامِ خواجگی
ہر کس و نا کس کو تیرا غم عطا ہوتا نہیں

اس قسم کے سینکڑوں اشعار میں ساغر نے اپنے باطنی تجربوں کے حوالے سے معروضی حقائق سے بھی پردہ اٹھایا ہے اس کے اسلوب کی پرکھ تو کوئی نقاد ہی کر سکتا ہے کہ ساغر نے کس طرح اپنے تجربات مشاہدات کو غزل کی روائتی خوبیوں کے پیکر میں ندرت اور جدت سے ڈھالا ہے وہ حیات و کائنات کے قریبی مشاہدے کا جہاں جہاں بھی ذکر کرتا ہے اس کا ہر شعر شعلے کی طرح ایک کرا احساس کے دامن کو چھونے لگتا ہے۔

لوگ جس بزم سے آتے ہیں ستارے لے کر
ہم اُسی بزم سے بادیدۂ نم آتے ہیں

اب تو مدت سے رہ و رسمِ نظارہ بند ہے
اب تو ان کا طُور پہ بھی سامنا ہوتا نہیں

وہ گذر گیا ہے ساغرؔ کوئی قافلہ چمن سے
کہیں آگ جل رہی ہے کہیں راکھ سو گئی ہے

یہ وہ شعر ہیں جن میں ساغر کی شدتِ احساس کو تو میں محسوس کر سکتا ہوں لیکن ان کا لفظوں میں اظہار نہیں کر سکتا، مجھے اپنی کم مائگی کا پورا پورا اعتراف ہے لیکن جس چیز نے مجھے اس کے بارے میں لکھتے ہوئے شعروں کا حوالہ دینے پر مجبور کیا ہے، وہ ہے اس کے بنیادی خیال کی صداقت، عظمت بلندی و سادگی اور جذبے کی سچائی میں اس کے اشعار پڑھتا ہوں تو ان کے الفاظ اور معانی واقعی ایک صورتِ گویائی میں ڈھل جاتے ہیں۔

اپنے ہوش و حواس کی دنیا میں آنے کے بعد نہ صرف اس نے اپنے باطنی مشاہدوں کو شعروں کا لباس دیا بلکہ اپنے گرد و پیش کی حقیقتوں کو قلندرانہ عظمت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور جس طرح ایک صوفی اپنی تکمیل کے بعد اس بات کا پابند ہے کہ وہ اپنے عصر، اپنے معاشرے اور اپنے ارد گرد رہنے والے لوگوں کی راہنمائی کرے، ان کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہو اور سچائیوں کے اظہار کا فرض دیانتداری سے ادا کرے اسی طرح ساغر نے بھی یہ فرض پوری دیانتداری سے ادا کیا ہے۔ وہ گرد و پیش میں ہونے والے حادثات کو اپنے فکر کے حوالے سے انتہائی جرأت سے قلمبند کرتا تھا، جھوٹی اقدار کے خلاف اس کا رویہ بے حد جارحانہ نظر آتا ہے۔

یا رب ترے جہان کے کیا حال ہو گئے
کچھ لوگ خواہشات کے دلال ہو گئے

---

ہر اک ذہن میں ہے خدائی کا دعویٰ
ہر اک آستیں میں صنم سو رہے ہیں

جگمگاتے ہیں وحشتوں کے چراغ
عقل نے آدمی کو بیچ دیا۔
راہگزاروں پہ لٹ گئی رادھا
شام نے بانسری کو بیچ دیا۔
عشق بہروپیا ہے اے ساغر
روپ نے سادگی کو بیچ دیا۔

مری اجڑی اجڑی سی آنکھوں میں ساغر
زمانے کے رنج و الم سو رہے ہیں

میں اس سے زیادہ ساغر کو بیان نہیں کر سکتا۔ انتخاب آپ کے سامنے ہے۔ میں اس کے انتخاب میں کہاں تک انصاف کر سکا ہوں، اس کا فیصلہ آپ پر ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ ساغر کو اس کے شعروں کی سچائی کے حوالے سے ہی سمجھنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ اس کے ظاہری وجود اور رہن سہن کی مدد حاصل کریں گے تو اس ساغر کو نہ پا سکیں گے، جس نے اس شہر میں جوگیوں اور سادھوؤں کی طرح زندگی بسر کی۔ اور جیسی بھی زندگی اسے ملی اس نے صبر و رضا کے ساتھ قبول کی۔ لیکن وہ سب کا دوست تھا اور میں نے اس کے منہ سے کبھی کسی کی برائی نہیں سنی۔ وہ اتنا پاکیزہ خیال تھا کہ سطحی اور پوچ خواہشیں اس کے قریب آتے ہوئے ڈرتی تھیں اور اتنا بے نیاز کہ دوسری صبح کے لئے کچھ بچا کر رکھنا۔ اس کے لئے بہت ہی مشکل تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اس کے پاس بہت روپے ہوتے، اور وہ رات ہونے سے پہلے پہلے خرچ کر دیتا، اپنے ساتھ فٹ پاتھ پہ بیٹھنے والوں کی دعوت کر دیتا اور کوئی اگر اسے کہتا،

ساغر! صبح کے لئے کچھ بچا لیا کرو، آخر صبح بھی ہونی ہے۔

وہ مسکرا کر کہتا "حضرت! صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی جو تنازعہ شروع ہو جاتا ہے اس کی لذت سے کیسے دستبردار ہو جاؤں۔

یہ ہے وہ ساغر جس نے اپنے حسن آوارگی کا ان لفظوں میں اظہار کیا ہے۔

آوارگی برنگِ تماشہ بری نہیں
ذوقِ نظر ملے تو یہ دنیا بری نہیں

اس شعر کے ساتھ مجھے اس کی زندگی کے آخری لمحات یاد آ گئے ہیں ۔ اس نے داتاؒ دربار کے سامنے ایک ہوٹل کے فٹ پاتھ پر مستقل ڈیرا جما لیا تھا ۔ شام ہوتے ہی وہ اپنا کمبل بچھا کر اپنی محفل کا آغاز کر دیتا ، موم بتیاں اور اگر بتیاں روشنی اور خوشبو پھیلاتے لگتیں وہ داتا حضورؒ کے مزار کی طرف منہ کرکے سرشاری و کیف میں ڈوب جاتا ۔ اتنے میں کئی لوگ آ جاتے شاعر ادیب اور فقیر منش انسان ، شعر و شاعری ہوتی اور افکار و خیالات کی دنیا کے دروازے کھل جاتے ۔ اس علاقے میں مستقل قیام کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتا ۔

داتاؒ کے دربار کی گلیاں مدینے کی گلیاں ہیں

آخری دنوں میں وہ مکمل طور پر نعت گوئی کے لئے وقف ہو گیا تھا اور نعتیں سناتے ہوئے اتنا مست ہو جاتا کہ اس کی آنکھیں نم آلود ہو جاتیں اور وہ فوراً ہوا کے جھونکے کی طرح گذر جاتا ، وہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مستغرق تھا اور اپنی عاشقانہ مستیوں کے ساغر پہ ساغر لٹاتا تھا ۔ اپنی ذات سے مسلسل بے توجہی کے باعث اس کی صحت تیزی سے خراب ہو رہی تھی ، اس کے دائیں ہاتھ پر فالج نے گہرا اثر کیا تھا اور وہ لکھنے سے معذور سا ہو گیا تھا ، نگاہ تو پہلے ہی کم ہو چکی تھی ۔ کبھی کبھی عینک بھی لگانے لگا لیکن اس نے اس تکلف کو بھی خیر باد کہہ دیا ۔ جسم اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ چھڑی کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا لیکن چھڑی بھی زیادہ ساتھ نہ دیکھ سکی ، پردہ پوش ہونے سے پہلے آواز بھی دم توڑ گئی تھی ۔ وہ بولتا تو کچھ سنائی نہ دیتا لیکن اس کا تخلیقی جوہر پہلے سے کہیں زیادہ توانا تھا ۔ موت سے چند دن پہلے ایک شام انار کلی میں اچانک ملاقات ہو گئی اور اس نے وہیں کھڑے کھڑے ایک غزل سنائی جو اس کی زندگی کی آخری غزل ہے ۔

شبِ فراق کوئی گنگنا کے گذرا ہے
کہ بن گئی ہے ستاروں کی روشنی آواز

پھر میں نے اسے خون تھوکتے ہوئے دیکھا ۔ وہ اتنا نڈھال تھا کہ سانس بھی نہیں لے سکتا تھا ۔ دو قدم چلتا تو بیٹھ جاتا ۔ دوستوں کو بڑی تشویش تھی لیکن وہ علاج کے لئے نہ مانا ۔ چند دن لوہاری کے باہر ایک تھڑے کے نیچے پڑا رہا ، پھر اچانک غائب ہو گیا اور تیسرے دن اس کے انتقال کی خبر ملی تو اس کا یہ شعر یاد آ گیا ۔

اگرچہ ہم جا رہے ہیں محفل سے نالۂ دلفگار بن کر
مگر یقیں ہے کہ لوٹ آئیں گے نغمۂ نو بہار بن کر
جہان والے ہمارے گیتوں سے جائزہ لیں گے سسکیوں کا
جہاں میں پھیل جائیں گے ہم بشر بشر کی پکار بن کر

---

ساغر کے عاشق اور اپنے دمساز

سعید قیس افروز

کے نام

یونس ادیب

اِس رہزنِ حیات زمانے سے دُور چل
مر بھی گئے تو چادرِ صحرا بُری نہیں

ــــــــ ساغر صدیقی

# حرفِ آغاز

شریعتِ غمِ ہستی سنّوارنے والے
تجلّیوں کو فلک سے اُتارنے والے

خُدا گواہ! کہ کانٹوں پہ رقص کرتے تھے
چمن چمن کا مقدّر نکھارنے والے

اُفق سے پار بھی جس کا نشاں نہیں مِلتا
بہت قریب سے اُس کو پکارنے والے

دِلوں کو بخش گئے ہیں قرار کی دولت
تمام عمر تڑپ کر گزارنے والے

کبھی تھے دار کے قابل کبھی سرِ مقتل
سروں کو نامِ محمدؐ پہ وارنے والے

(۰)

دِل ملا اور غم شناس ملا
پھُول کو آگ کا لباس ملا

ہر شناور بھنْور میں ڈوبا تھا
جو ستارہ ملا اُداس ملا

میکدے کے سوا ہمارا پتہ
اُن کی زُلفوں کے آس پاس ملا

مُجھ کو تقدیر کی گذر گہ میں
صرف تدبیر کا ہراس ملا

آبِ حیواں کی دُھوم تھی ساغرؔ
سادہ پانی کا اک گلاس ملا

(۱)

اَے حسنِ لالہ فام ذرا آنکھ تو مِلا!
خالی پڑے ہیں جام ذرا آنکھ تو مِلا!

کہتے ہیں آنکھ آنکھ سے ملنا ہے بندگی
دُنیا کے چھوڑ کام ذرا آنکھ تو مِلا!

کیا وہ نہ آج آئیں گے تاروں کے ساتھ ساتھ
تنہائیوں کی شام ذرا آنکھ تو مِلا!

یہ جام، یہ سبُو، یہ تصوّر کی چاندنی
ساقی! کہاں مدام؟ ذرا آنکھ تو مِلا!

ساقی مجھے بھی چاہیے اِک جامِ آرزو
کتنے لگیں گے دام ذرا آنکھ تو مِلا!

پامال ہو نہ جائے ستاروں کی آبرو
اے میرے خوش خرام ذرا آنکھ تو مِلا!

ہیں راہِ کہکشاں میں ازل سے کھڑے ہوئے
ساغرؔ ترے غلام ذرا آنکھ تو مِلا!

○

ہر مرحلۂ شوق سے لہرا کے گزر جا
آثارِ تلاطم ہوں تو بل کھا کے گزر جا

بہکی ہوئی مخمور گھٹاؤں کی صدا سُن
فردوس کی تدبیر کو بہلا کے گزر جا

مایوس ہیں احساس کی اُلجھی ہوئی راہیں
پایل دِل مجبور کی چھنکا کے گزر جا

یزدان و اہرمن کی حکایات کے بدلے
انساں کی روایات کو دُہرا کے گزر جا

کہتی ہیں تجھے میکدۂ وقت کی راہیں
بگڑی ہوئی تقدیر کو سمجھا کے گزر جا

بجھتی ہی نہیں تشنگیٔ دِل کِسی صُورت
اے ابرِ کرم آگ ہی برسا کے گزر جا

کانٹے جو لگیں ہاتھ تو کچھ غم نہیں ساغرؔ
کلیوں کو ہر اک گام پہ بکھرا کے گزر جا

○

تفریق نے جادو ہی جگایا ہے بلا کا
خطرے میں ہے اے یار، چمن مہر و وفا کا

توہین ہے درویش کا اس شہر میں جینا
ہو فاقہ کشی نام جہاں صبر و رضا کا

اب ان کا تفکّر، غمِ تقدیر کا چارہ
سینے میں پتہ رکھتے تھے جو ارض و سما کا

جی چاہتا ہے اے مرے افکار کی مورت
ملبوس بنا دوں تجھے تاروں کی ردا کا

محفوظ رہیں میرے گلستاں کی فضائیں
ہو قتلِ گل و لالہ تقاضا ہے صبا کا

جلتے ہوئے دیکھے وہی معصوم شگوفے
تھا جن کو بھروسہ ترے دامن کی ہوا کا

کچھ سردسی آہیں ہیں تو کچھ ڈوبتے آنسو
ساغرؔ یہ صلہ تجھ کو ملا سوزِ نوا کا

○

محبّت مستقل غم ہے، محبت غم کا گہوارہ
جو آنسو رنگ لے آئے وہی دامن کا شہ پارہ

جسے ارماں کا خوں دے کر بنامِ آرزو سینچا
خدا جانے کہاں ہے وہ جنونِ زندگی آرا

مرا ذوقِ خریداری ہے اِک جنسِ گراں مایہ
کبھی پھولوں کی شیدائی کبھی کانٹوں کا بنجارا

جہاں منصب عطا ہوتے ہیں بے فکر و فراست بھی
وہاں ہر جستجو جھوٹی وہاں ہر عزم ناکارا

بسا اوقات چھُو لیتی ہے دامن کبریائی کا
تمہاری جنبشِ ابرُو، مری تخلیقِ آوارا

نہ جانے محتسب کیوں میکدے کا نام دیتے ہیں
جہاں کچھ آدمی کرتے ہیں اپنے درد کا چارا

ترے گیسو خیالوں کی گرفتِ ناز سے گزرے
کہ جیسے ایک جوگی بن میں لہراتا ہے دوتارا

پلٹ آئے ہیں شاید انقلابِ دید کے لمحے
نظر کی وسعتوں میں ڈوبتا جاتا ہے نظارا

فقط اک ہات میں ٹوٹا ہوا ساغر اُٹھانے سے
لرز اُٹھا ہے اے یزداں! تری عظمت کا مینارا

○

آج رُوٹھے ہوئے ساجن کو بہت یاد کیا
اپنے اُجڑے ہوئے گُلشن کو بہت یاد کیا

جب کبھی گردشِ تقدیر نے گھیرا ہے ہمیں
گیسوئے یار کی اُلجھن کو بہت یاد کیا

شمع کی جوت پہ جلتے ہوئے پروانوں نے
اِک ترے شعلۂ دامن کو بہت یاد کیا

جس کے ماتھے پہ نئی صُبح کا جھُومر ہو گا
ہم نے اُس وقت کی دُلہن کو بہت یاد کیا

آج ٹوٹے ہوئے سپنوں کی بہت یاد آئی
آج بیتے ہوئے ساون کو بہت یاد کیا

ہم سرِ طُور بھی مایوسِ تجلّی ہی رہے
اُس درِ یار کی چلمن کو بہت یاد کیا

مطمئن ہو ہی گئے دام و قفس میں ساغرؔ
ہم اسیروں نے نشیمن کو بہت یاد کیا

---

○

شعلۂ رُخ مست نظر یاد آیا
رشکِ خورشید و قمر یاد آیا

اشک آنکھوں سے چھلکتے ہی رہے
جب کبھی وہ گُلِ تر یاد آیا

آج کھولی جو بیاضِ غالب
معدنِ لعل و گہر یاد آیا

برق چمکی تو نشیمن دیکھا
شاخ ٹوٹی تو ثمر یاد آیا

چاند کی سمت جو دیکھا ساؔغر
اپنے ارماں کا سفر یاد آیا

---

○

مَیں کہ آشفتہ و رُسوا سرِ بازار ہُوا
چاک داماں کا تماشا سرِ بازار ہُوا

تیری عصمت کی تجارت پسِ دیوار سہی
میری تقدیر کا سَودا سرِ بازار ہوا

پھر کوئی اہلِ جنوں دار پہ چڑھ جائیگا
پھر ترے حُسن کا چرچا سرِ بازار ہُوا

ہم نے رکھا ہے اُسے دل کے مکاں میں برسوں
جو کبھی ہم سے شناسا سرِ بازار ہوا

مرحلے دید کے دُشوار تھے لیکن ساغر
منزلِ طور کا جلوہ سرِ بازار ہُوا

---

○

احتیاطاً فقر کا ہر مرحلہ کٹتا رہا
اتفاقاً آپ کی خیرات کا دھڑکا رہا

آج پھر شبنم کے قطروں نے بجایا جلترنگ
آج پھر دامن مری آواز کا بھیگا رہا

کوئی آیا ہے نہ آئے گا دلِ ناداں کبھی
میرے دروازے کا پردہ تو سدا ہلتا رہا

رات کی رانی کا جھونکا تھا کسی کی یاد بھی
دیر تک آنگن مرے احساس کا مہکا رہا

تیز رو چلتے ہیں ساغرؔ قافلے اس نام سے
رہنماؤں سے ہمیشہ راہزن اچھا رہا

---

○

اِس درجہ عشق موجبِ رُسوائی بن گیا
مَیں آپ اپنے گھر کا تماشائی بن گیا

دیر و حرم کی راہ سے دِل بچ گیا مگر
تیری گلی کے موڑ پہ سودائی بن گیا

بزمِ وفا میں آپ سے اِک پل کا سامنا
یاد آ گیا تو عہدِ شناسائی بن گیا

بے ساختہ بِکھر گئی جلوؤں کی کائنات
آئینہ ٹوٹ کر تری انگڑائی بن گیا

دیکھی جو رقص کرتی ہوئی موجِ زندگی
میرا خیال وقت کی شہنائی بن گیا

---

○

یقین کر کہ یہ کہنہ نظام بدلے گا
مرا شعور مزاجِ عوام بدلے گا

یہ کہہ رہی ہیں فضائیں بہارِ ہستی کی
نیا طریقِ قفس اور دام بدلے گا

نفس نفس میں شرارے سے کروٹیں لیں گے
دلوں میں جذبۂ محشر خرام بدلے گا

مروّتوں کے جنازے اُٹھائے جائیں گے
سُنا ہے ذوقِ سلام و پیام بدلے گا!

دل و نظر کو عطا ہوں گی مستیاں ساغرؔ
یہ بزمِ ساقی یہ بادہ یہ جام بدلے گا

○

دردکے ماروں پہ ہنستا ہے زمانہ بے خبر!
زخمِ ہستی کی کسک سے ہے نشانہ بے خبر!

نکہتوں کے سائے میں بکھرے ہوئے ہیں چند پھول
بجلیوں کی یورشوں سے آشیانہ بے خبر!

حُسنِ برہم کو نہیں حالِ پریشاں سے غرض!
سازِ دل کی دھڑکنوں سے ہے ترانہ بے خبر!

دونوں عالم وُسعتِ آغوش کی تفسیر ہیں!
دیکھنے میں ہے نگاہِ مُحرمانہ بے خبر!

آپ اپنے فن سے ناواقف ہے ساغر کی نظر
لعل و گوہر کی ضیاؤں سے خزانہ بے خبر!

○

قریبِ دار کٹا دن، تو رات کانٹوں پر
گزار دی ہے کسی نے حیات کانٹوں پر

تغیّرات سے افزوں ہے ارتقاء کا مزاج
بِلا کلی کو چمن میں ثبات کانٹوں پر

بلا سے دامنِ ہستی جو تار تار ہُوا
مِرے جنُوں نے لگائی ہے گھات کانٹوں پر

چٹک رہے ہیں شگُوفے تمہاری یادوں کے
سجی ہے شبنم و گل کی برات کانٹوں پر

یہ اور بات ہے، پھُولوں کا ذکر تھا ساغرؔ
کہ اتّفاق سے پہنچی ہے بات کانٹوں پر

○

پھُول چاہے تھے مگر ہاتھ میں آئے پتّھر!
ہم نے آغوشِ محبّت میں سُلائے پتّھر!

وحشتِ دِل کے تکلّف کی ضرورت کے لئے
آج اُس شوخ نے زلفوں میں سجائے پتّھر

اُن کے قدموں کے تلے چاند ستارے دیکھے!
اپنی راہوں میں سُلگتے ہُوئے پائے پتّھر!

مَیں تری یاد کو یوں دِل میں لئے پھِرتا ہُوں
جیسے فرہاد نے سینے سے لگائے پتّھر

فکرِ ساغر کے خریدار نہ بھُولیں گے کبھی!
میں نے اشکوں کے گہر تھے جو بنائے پتّھر

---

○

ہنس نہیں سکتے شگوفے تازگی سے رُوٹھ کر
ہم زمانے میں جیے ہیں زندگی سے رُوٹھ کر

خود منانے کے لئے آئے مجھے دَیر و حرم
سجدۂ الہام پایا بندگی سے رُوٹھ کر

غم سے رونق ہو گئی کاشانۂ تقدیر میں
مُطمئن ہے دِل کی دُنیا ہر خوشی سے رُوٹھ کر

ایک دن ساقی یہی ٹوٹے ہُوئے جام و سبُو!
میکدے ترتیب دیں گے تشنگی سے رُوٹھ کر

سوچتے ہیں حسرتوں کے موڑ پر شام و سحر
جائیں گے ساغرؔ کہاں اُن کی گلی سے رُوٹھ کر

---

○

اگرچہ ہم جا رہے ہیں محفل سے نالۂ دِل فگار بن کر
مگر یقیں ہے کہ لوٹ آئیں گے نسخۂ نو بہار بن کر

جہان والے ہمارے گیتوں سے جائزہ لیں گے سسکیوں کا
جہان میں پھیل جائیں گے ہم بشر بشر کی پکار بن کر

بہار کی بدنصیب راتیں بُلا رہی ہیں، چلے بھی آؤ!
کسی ستارے کا رُوپ بن کر، کسی کے دل کا قرار بن کر

ضرورتِ راہ کے مُطابق مسافروں نے بھی سیکھ لی ہے
وہ رہبری مُدّتوں رہی ہے جو رہبروں کا شکار بن کر

٭ تلاشِ منزل کے مرحلوں میں یہ حادثہ اِک عجیب دیکھا
فریب راہوں میں بیٹھ جاتا ہے صورتِ اعتبار بن کر

٭ یہ کیا قیامت ہے باغبانو! کہ جن کی خاطر بہار آئی
وہی شگوفے کھٹک رہے ہیں تمہاری آنکھوں میں خار بن کر

سکوتِ غم سے جو گُذرے نہ پھر ملی آواز
یہی کہیں اِنہی گلیوں میں کھو گئی آواز

یہ کہکشاں مرے نغمات کی لڑی یارو!
کرن کرن کی سماعت میں ہے مری آواز

بہت دنوں سے ہے پامال دِل کا ہر غنچہ!
مَیں منتظر ہوں کوئی آئے شبنمی آواز

نہ چھیڑ عُذرِ محبّت کی داستان اے دوست
کہ بزمِ عشق میں ہوتی ہے خامشی آواز

مَیں خود نگر ہوں کسی موڑ پر نہ ٹھہروں گا
ازل سے دیتی رہی مجھ کو زندگی آواز

شبِ فراق کوئی گُنگُنا کے گُذرا ہے
کہ بن گئی ہے ستاروں کی روشنی آواز

خُدا کرے کہ ستاروں کو چھُو سکے ساغرؔ
سُرودِ زیست کے پردوں میں ڈوبتی آواز

---

○

خیال ہے کہ بجھا دوں یہ روشنی کے چراغ
کہ مستیوں نے جلائے ہیں بیخودی کے چراغ

چلو نگاہ کی مشعل کو ساتھ لے کے چلیں
فرازِ شوق پہ روشن ہیں آگہی کے چراغ

روش روش پہ ہراساں ہیں چاند کی کرنیں
قدم قدم پہ سُلگتے ہیں بیکسی کے چراغ

مچل رہے ہیں بہت سانپ آستینوں میں
بھڑک رہے ہیں ابھی شامِ دوستی کے چراغ

جلا رہا ہے کوئی شامِ آرزو کے دیئے
بُجھا رہا ہے کوئی صُبحِ دلبری کے چراغ

اُچھال ساغرِ مے دِل بحال ہوں ساقی
کہ روشنی کو ترستے ہیں زندگی کے چراغ

---

○

مانگی ہے اس دیار میں دونوں جہاں کی بھیک
لیکن ملی ہمیں دلِ ناکامراں کی بھیک

ایسے بھی راہِ زیست میں آئے کئی مقام
مانگی ہے پائے شوق نے عزمِ جواں کی بھیک

بے نور ہو گئی ہیں ستاروں کی بستیاں
ساقی عطا ہو بادۂ شعلہ فشاں کی بھیک

اب اور کیا تغیّرِ تقدیر چاہیئے
جھولی میں ڈال دی ترے نام و نشاں کی بھیک

خود بِک گئے حیات کی نیلام گاہ میں
وہ بانٹتے تھے جو کبھی کون و مکاں کی بھیک

دو چار پتّیوں پہ ہے رنجش بہار سے
سائل نے مانگ لی ہے کہاں گلستاں کی بھیک

اللہ اُن کے نقشِ کفِ پا کی خیر ہو!
ذرّوں کو دے گئے جو مہ و کہکشاں کی بھیک

ساغرؔ خوشا کہ گوہرِ اُمید پا لیا
قسمت سے ہاتھ آئی غمِ دوستاں کی بھیک

---

○

کِھلتے رہیں گے صحنِ چمن میں ہزار پھُول
لیکن کہاں نصیب تمنّا میں چار پھُول

شاید یہیں کہیں ہو ترا نقشِ پائے ناز
ہم نے گرا دیئے ہیں سرِ رہگذار پھُول

بھونروں کو جُستجو ہے تِری کُنج کُنج میں
شاخوں پہ کر رہے ہیں ترا انتظار پھُول

آوارگانِ شوق چلو ہم کریں تلاش
وہ کارواں جو چھوڑ گیا ہے غبارِ پھُول

کانٹوں پہ جی لئے کبھی پھولوں پہ مر لئے
اپنی نظر میں ایک ہیں گلشن میں خار، پھول

کھولے ہیں اس نے گیسوئے عنبر فشاں ضرور
کچھ حد سے ہو گئے ہیں سوا مشکبار پھول

ہائے شہید ناز کی تربت پہ رونقیں
مدھم سی ایک شمع ہے دو سوگوار پھول

ساغرؔ بہار میں نہ رہی مے کی جستجو!
شیشے میں بھر کے پی گیا اک بادہ خوار پھول

○

ایک نغمہ، ایک تارا، ایک غنچہ، ایک جام
اے غمِ دوراں! غمِ دوراں! تجھے میرا سلام

زلف آوارہ، گریباں چاک، گھبرائی نظر
ان دنوں یہ ہے جہاں میں زندگانی کا نظام

چند تارے ٹوٹ کر دامن میں میرے آ گرے
میں نے پوچھا تھا ستاروں سے ترے غم کا مقام

کہہ رہے ہیں چند بچھڑے رہرووں کے نقشِ پا
ہم کریں گے انقلابِ جستجو کا اہتمام

پڑ گئیں پیراہنِ صُبحِ چمن پر سلوٹیں
یاد آ کر رہ گئی ہے بیخودی کی ایک شام

تیری عصمت ہو کہ ہو میرے ہُنر کی چاندنی
وقت کے بازار میں ہر چیز کے لگتے ہیں دام

ہم بنائیں گے یہاں ساؔغر نئی تصویرِ شوق
ہم تخیّل کے مجدّد، ہم تصوّر کے امام

---

لوگ لے لیتے ہیں یونہی شمع پروانے کا نام
کچھ نہیں ہے اس جہاں میں غم کے افسانے کا نام

مٹ گئی بربادیٔ دل کی شکایت دوستو
اب گلستاں رکھ لیا ہے میں نے ویرانے کا نام

شوخیٔ قدِ نگاراں میری صہبا کا وجود
مستیٔ چشمِ غزالاں میرے پیمانے کا نام

اس کو کہتے ہیں غمِ تقدیر کی نیلام گاہ
ہے زبانِ تشنگی میں اور میخانے کا نام

دیکھئے! ساغر کی آشفتہ نگاہی کا کمال
مستیاں چھلکا رہا ہے ایک دیوانے کا نام

○

پھول جلتے ہیں ہار جلتے ہیں
چاندنی کے مزار جلتے ہیں

اے مصوّر! یہ کیا تماشا ہے
رنگ سے شاہکار جلتے ہیں

مُدّتوں سے ہے سرد مے خانہ
دیر سے مے گسار جلتے ہیں

کچھ پتنگے چراغ کی لَو پر
کتنے بے اختیار جلتے ہیں

تیرے آنچل کی شوخ چھاؤں میں
بے خودی کے دیار جلتے ہیں

روکیے بے قرار کاکل کو
دیکھیے! لالہ زار جلتے ہیں

فکرِ ساغر کی گرمیاں مت پوچھ
اِس چِتا میں نگار جلتے ہیں

---

○

ستم جاگتے ہیں، کرم سو رہے ہیں
محبّت کے جاہ و حشم سو رہے ہیں

مرے نکتہ سازو! سخن کے خداؤ!
پکارو! کہ لوح و قلم سو رہے ہیں

ہر اک ذہن میں ہے خدائی کا دعویٰ
ہر اک آستیں میں صنم سو رہے ہیں

یہاں خوابِ راحت فریبِ یقیں ہے
نہ تم سو رہے ہو نہ ہم سو رہے ہیں

وہاں چاندنی کے قدم ڈولتے ہیں
جہاں تیرے نقشِ قدم سو رہے ہیں

تخیّل میں ہیں گیسوؤں کے بہانے
نگاہوں میں رنگیں بھرم سو رہے ہیں

مری اُجڑی اُجڑی سی آنکھوں میں ساغرؔ
زمانے کے رنج و الم سو رہے ہیں

---

وسعتِ گیسوئے جاناں سے اُلجھ بیٹھے ہیں
صورتِ گردشِ دوراں سے اُلجھ بیٹھے ہیں

مدحتِ بادۂ انگور کی خاطر ساقی
رند اِک صاحبِ ایماں سے اُلجھ بیٹھے ہیں

چند نغمے جو مِرے سازِ جنوں نے چھیڑے
مستیٔ چشمِ غزالاں سے اُلجھ بیٹھے ہیں

آج گمنامیٔ احساس کا پرچم لے کر
آدمی شہرتِ یزداں سے اُلجھ بیٹھے ہیں

ایسے کچھ لوگ جنہیں صاحبِ اخلاص کہیں
پھر مِرے حالِ پریشاں سے اُلجھ بیٹھے ہیں

نکہتیں صحنِ گُلستاں سے خبر لائی ہیں
پھُول آدابِ گلستاں سے اُلجھ بیٹھے ہیں

کچھ پتنگے کہ عطا ہے جنہیں شُعلوں کا مزاج
رونقِ شامِ چراغاں سے اُلجھ بیٹھے ہیں

---

سرِ مقتل ہمیں نغمات کی تعلیم دیتے ہیں
یہاں اہلِ نظر ظلمات کی تعلیم دیتے ہیں

یہاں کلیاں مہکتی ہیں مگر خوشبو نہیں ہوتی
شگوفے برملا آفات کی تعلیم دیتے ہیں

یہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں زرتابی قباؤں میں
سحر کا نام لے کر رات کی تعلیم دیتے ہیں

جنہیں فیضانِ گلشن ہے نہ عرفانِ بہاراں ہے
وہ پھولوں کو نئے جذبات کی تعلیم دیتے ہیں

رہِ تقدیر اُس دن کے لئے کیا دھوپ اور سائے
ترے گیسو جنہیں حالات کی تعلیم دیتے ہیں

ہمیں زیبا نہیں دیتا رہِ دُشوار کا منظر
کہ صحراؤں میں بھی برسات کی تعلیم دیتے ہیں

جہاں ساغر شرابِ زندگی اک زہرِ قاتل ہے
یقیں والے وہاں خدشات کی تعلیم دیتے ہیں

وقارِ انجمن ہم سے فروغِ انجمن ہم ہیں!
سکوتِ شب سے پوچھو صبح کی پہلی کرن ہم ہیں

ہمیں سے گلستاں کی بجلیوں کو خاص نسبت ہے
بہاریں جانتی ہیں رونقِ صحنِ چمن ہم ہیں

زمانے کو نہ دے الزام اَے ناواقفِ منزل
زمانے کی نظر ہم ہیں زمانے کا چلن ہم ہیں

قریب و دُور کی باتیں نظر کا وہم ہیں پیارے
یقینِ رہنما ہم سے فسونِ راہزن ہم ہیں

طلوعِ آفتابِ نَو ہمارے نام پر ہو گا!
وہ جن کی خاک کے ذّرے ہیں خورشید وطن ہم ہیں

بہر صورت ہماری ذات سے ہیں سلسلے سارے
جنوں کی سادگی ہم ہیں خرد کا بانکپن ہم ہیں

ہمارے ہاتھ میں ہے ساغرِ فردا اِدھر دیکھو!
اِدھر دیکھو! حریفِ گردشِ چرخِ کہن ہم ہیں

---

○

تیرے دامن کی ہَوا مانگتے ہیں
ہم بھی جینے کی دُعا مانگتے ہیں

مطربو! کوئی اَچھوتا نغمہ
سازِ آہنگ و صدا مانگتے ہیں

بندہ پرور! کوئی خیرات نہیں
ہم وفاؤں کا صِلہ مانگتے ہیں

پھر پتنگوں میں خُدائی جاگی
شعلۂ حشر نُما مانگتے ہیں

صحنِ کعبہ کے پجاری مچلے
آستینوں میں خدا مانگتے ہیں

مے کدہ ہو کہ کلیسا، بابا!
ساری دُنیا کا بھلا مانگتے ہیں

ماہ و انجم کے جھروکے سے آغر
کس کے عارض کی ضیا مانگتے ہیں

---

یہ جو دیوانے سے دو چار نظر آتے ہیں
ان میں کچھ صاحبِ اسرار نظر آتے ہیں

تیری محفل کا بھرم رکھتے ہیں سو جاتے ہیں
ورنہ یہ لوگ تو بیدار نظر آتے ہیں

میرے دامن میں شراروں کے سوا کچھ بھی نہیں
آپ پھولوں کے خریدار نظر آتے ہیں

دُور تک کوئی ستارہ ہے نہ کوئی جگنو
مرگِ اُمید کے آثار نظر آتے ہیں

کل جنھیں چھو نہیں سکتی تھی فرشتوں کی نظر
آج وہ رونقِ بازار نظر آتے ہیں

حشر میں کون گواہی مری دے گا ساغرؔ
سب تمھارے ہی طرفدار نظر آتے ہیں

---

○

ایک وعدہ ہے کسی کا جو وفا ہوتا نہیں
ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں

جی میں آتا ہے اُلٹ دیں اُن کے چہرے سے نقاب
حوصلہ کرتے ہیں لیکن حوصلہ ہوتا نہیں

شمع جس کی آبرو پر جان دیدے جھوم کر
وہ پتنگا جل تو جاتا ہے فنا ہوتا نہیں

اب تو مدّت سے رہ و رسمِ نظارہ بند ہے
اب تو اُن کا طُور پر بھی سامنا ہوتا نہیں

ہر بھکاری پا نہیں سکتا مقامِ خواجگی
ہر کس و ناکس کو تیرا غم عطا ہوتا نہیں

ہر شناور کو نہیں ملتا تلاطم سے خراج
ہر سفینے کا محافظ، ناخُدا ہوتا نہیں

بارہا! دیکھا ہے ساؔغر رہگذارِ عشق میں!
کارواں کے ساتھ اکثر رہنما ہوتا نہیں

---

○

آوارگی برنگِ تماشا بُری نہیں
ذوقِ نظر ملے تو یہ دُنیا بُری نہیں

کہتے ہیں تیری زُلف پریشاں کو زندگی
اے دوست! زندگی کی تمنّا بُری نہیں
ہو تو کوئی نہیں

ہے ناخُدا کا میری تباہی شمار رہتے ہیں
مَیں جانتا ہُوں نیّتِ دریا
نظر سے گزرا ہے

ذوق جنوں کے ساتھ ہے شکار رہتے ہیں
شبنم کے ساتھ گرمیٔ شعلہ بُر

اِس رہزنِ حیات زمانے سے دُور چل
مر بھی گئے تو چادرِ صحرا بُری نہیں

ساغرؔ کے ساتھ چل کے کبھی میکدے میں سُن
اتنی حدیثِ بادہ و مینا بُری نہیں

خیالِ یار میں ہم پُر بہار رہتے ہیں
خزاں کے دن بھی ہمیں سازگار رہتے ہیں

چمن میں صرف ہمارا ہی ذِکر رہتا ہے
برنگِ لالہ ہمیں داغدار رہتے ہیں

یہ اور بات کہ تم آئے ہو تو کوئی نہیں
وگرنہ غم تو یہاں بے شمار رہتے ہیں

جہانِ قدس بھی میری نظر سے گُزرا ہے
وہاں بھی تیری نظر کے شکار رہتے ہیں

تجھے خبر نہیں محلوں میں بیٹھنے والے!
ترے فقیر سرِ رہ گذار رہتے ہیں

بصیرتوں کو نکھارا ہمیں نے اے ساغرؔ
تجلّیوں سے ہمیں ہمکنار رہتے ہیں

ہے دُعا یاد مگر حرفِ دُعا یاد نہیں
میرے نغمات کو اندازِ نوا یاد نہیں

ہم نے جن کے لئے راہوں میں بچھایا تھا لہو
ہم سے کہتے ہیں وہی عہدِ وفا یاد نہیں

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جُرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

مَیں نے پلکوں سے درِ یار پہ دستک دی ہے
مَیں وُہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

کیسے بھر آئیں سرِ شام کسی کی آنکھیں
کیسے تھرّائی چراغوں کی ضیاء، یاد نہیں

صرف دھندلائے ستاروں کی چمک دیکھی ہے
کب ہُوا کون ہُوا مجھ سے خفا یاد نہیں

آؤ اِک سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغرؔ کو خدا یاد نہیں

○

جب گُلستاں میں بہاروں کے قدم آتے ہیں
یاد بھُولے ہُوئے یاروں کے کرم آتے ہیں

لوگ جس بزم سے آتے ہیں ستارے لے کر
ہم اُسی بزم سے با دیدۂ نم آتے ہیں!

میں وہ اک رندِ خرابات ہوں میخانے میں
میرے سجدے کے لئے ساغرِ جم آتے ہیں

اب ملاقات میں وہ گرمیٔ جذبات کہاں!
اب تو رکھنے وہ محبّت کا بھرم آتے ہیں

قربِ ساقی کی وضاحت تو بڑی مشکل ہے
ایسے لمحے تھے جو تقدیر سے کم آتے ہیں

میں بھی جنّت سے نکالا ہوا اک بُت ہی تو ہوں
ذوقِ تخلیق تجھے کیسے ستم آتے ہیں!

چشمِ ساغر ہے عبادت کے تصوّر میں سدا
دل کے کعبے میں خیالوں کے صنم آتے ہیں

---

دستور یہاں بھی گونگے ہیں فرمان یہاں بھی اندھے ہیں
اے دوست خُدا کا نام نہ لے ایمان یہاں بھی اندھے ہیں

تقدیر کے کالے کمبل میں عظمت کے فسانے لپٹے ہیں
مضمون یہاں بھی بہرے ہیں عنوان یہاں بھی اندھے ہیں

زردار توقّع رکھتا ہے نادار کی گاڑھی محنت پر
مزدُور یہاں بھی دیوانے، ذیشان یہاں بھی اندھے ہیں

کچھ لوگ بھروسہ کرتے ہیں تسبیح کے چلتے دانوں پر
بیچین یہاں یزداں کا جنوں، انسان یہاں بھی اندھے ہیں

بے رنگ شفق سی ڈھلتی ہے بے نُور سویرے ہوتے ہیں
شاعر کا تصوّر بھوکا ہے سلطان یہاں بھی اندھے ہیں

۱۷

کچھ لوگ بچھا کر کانٹوں کو گلشن کی توقّع رکھتے ہیں
شعلوں کو ہوائیں دے دے کر ساون کی توقّع رکھتے ہیں

ماحول کے تپتے صحرا سے حالات کی اُجڑی شاخوں سے
ہم اہلِ جنوں پھولوں سے بھرے دامن کی توقّع رکھتے ہیں

جب سارا اثاثہ لُٹ جائے تسکینِ سفر ہو جاتی ہے
ہم راہ نماؤں کے بدلے رہزن کی توقّع رکھتے ہیں

سنگین چٹانوں سے دل کے دُکھنے کی شکایت کرتے ہیں
ظُلمت کے نگر میں نُورانی آنگن کی توقّع رکھتے ہیں

وہ گیسوئے جاناں ہوں ساغر یا گردشِ دوراں کے سائے
اے وائے مقدّر دونوں سے اُلجھن کی توقّع رکھتے ہیں

---

○

آلام کی یورش میں بھی خورسند رہے ہیں
نیرنگیٔ حالات کے پابند رہے ہیں

آفاق میں گونجی ہے مری شعلہ نوائی
نالے مرے افلاک کا پیوند رہے ہیں

ڈالی ہیں ترے خاک نشینوں نے کمندیں
ہر چند محلّات کے در بند رہے ہیں

ہر دور میں دیکھا ہے مری فکرِ رسا نے
کچھ لوگ زمانے کے خداوند رہے ہیں

ساغرؔ نہ ملی منزلِ مقصود خرد کو
ہاں قافلہ سالار جنوں مند رہے ہیں

مسکراؤ! بہار کے دن ہیں
گُل کھلاؤ! بہار کے دن ہیں

دُخترانِ چمن کے قدموں پر
سر جھکاؤ! بہار کے دن ہیں

مے نہیں ہے تو اشکِ غم ہی سہی
پی بھی جاؤ! بہار کے دن ہیں

تم گئے، رونقِ بہار گئی
تم نہ جاؤ! بہار کے دن ہیں

ہاں! کوئی وارداتِ ساغر و مے
کچھ سُناؤ! بہار کے دن ہیں

○

آزادیوں کے نام پہ رُسوائیاں ملیں
مشکل سے تیرے درد کی پہنائیاں ملیں

ساقی نے جھوٹ بولا ہے فصلِ بہار کا
گلشن میں صرف آپ کی انگڑائیاں ملیں

تجھ کو مِلے ہیں قریۂ مہتاب میں گڑھے
مجھ کو تو پتّھروں میں بھی رعنائیاں ملیں

اُن پر نثار محفلِ ہستی کی رونقیں
اے دوست امکدے میں جو تنہائیاں ملیں

ہر تجربے میں ساغرِ مے کا جواز ہے
ہر فلسفے میں زُلف کی گہرائیاں ملیں

---

○

چھپائے دِل میں غموں کا جہان بیٹھے ہیں
تمھاری بزم میں ہم بے زبان بیٹھے ہیں

یہ اور بات کہ منزل پہ ہم پہنچ نہ سکے
مگر یہ کم ہے کہ راہوں کو چھان بیٹھے ہیں

فغاں ہے، درد ہے، سوز و فراق و داغِ الم
ابھی تو گھر میں بہت مہربان بیٹھے ہیں

اب اور گردشِ تقدیر کیا ستائے گی
لُٹا کے عشق میں نام و نشان بیٹھے ہیں

ہے میکدے کی بہاروں سے دوستی ساغرؔ
ورائے حدِّ یقین و گماں بیٹھے ہیں

○

ایسی تجلّیاں ہیں کہاں آفتاب میں
انوارِ خاص ہیں مِرے جامِ شراب میں

یزداں نے مُسکرا کے بڑی دیر میں لکھا
اِک لفظِ آرزو مِرے دل کی کتاب میں

اب ذوقِ دید میں ہے شعورِ حیاتِ نو
جلووں کو احتیاط سے رکھو کتاب میں

محجوب تیرے حُسن سے غنچوں کی آبرو
خوشبو ترے بدن کی بسی ہے گلاب میں

ساغرؔ کسی کی یاد میں جب اشکبار تھے
کتنے حسین دن تھے جہانِ خراب میں

---

○

پھول مسلیں تو انہیں نغمہ و جھنکار ملیں
میں نے کانٹے تو نہیں بوئے کہ انگار ملیں

آنکھ لرزاں ہے سرِ محفلِ ہستی اے دوست!
اُن کی چلمن کے قریں تشنۂ دیدار ملیں!

اس کو لوکاک کی پُرنُور زباں کہتے ہیں
جس میں انساں کی تعظیم کے اطوار ملیں

خونِ دل شرط ہے اے یارِ بصیرت کے لئے
یہ بھی ممکن ہے کہ صحراؤں میں گلزار ملیں

حیف اُس چارہ گرِ وقت کی قسمت ساغرؔ
جس کو ہر گام پہ تقدیر کے بیمار ملیں

---

○

منزلِ غم کی فضاؤں سے لپٹ کر رو لُوں
تیرے دامن کی ہواؤں سے لپٹ کر رو لُوں

جامِ مے پینے سے پہلے مرا جی چاہتا ہے
بکھری زُلفوں کی گھٹاؤں سے لپٹ کر رو لُوں

زرد غنچوں کی نگاہوں میں نگاہیں ڈالوں
سُرخ پھُولوں کی قباؤں سے لپٹ کر رو لُوں

آنے والے ترے رستے میں بچھاؤں آنکھیں
جانے والے ترے پاؤں سے لپٹ کر رو لُوں

اپنے مجبُور تقدّس کے سہارے ساغرؔ
دیر و کعبہ کے خداؤں سے لپٹ کر رو لُوں

---

○

ہیں کتنی سازگار زمانے کی تلخیاں
تُو ہے تو پُربہار زمانے کی تلخیاں

دیکھی ہیں بارہا مِری چشمِ شعور نے
انسان کا وقار، زمانے کی تلخیاں

تم ساتھ ہو تو جانِ وفا میرے واسطے
پھُولوں کی رہگذار زمانے کی تلخیاں

اے رہروِ حیات ذرا جام تو اُٹھا!
بن جائیں گی قرار، زمانے کی تلخیاں

ساغرؔ یہی بلندی و پستی کا راز ہیں
تقدیسِ روزگار زمانے کی تلخیاں

---

○

چاندنی کو رسُول کہتا ہُوں
بات کو با اصُول کہتا ہوں

جگمگاتے ہُوئے ستاروں کو
تیرے پاؤں کی دُھول کہتا ہُوں

جو چمن کی حیات کو ڈس لے
اُس کلی کو ببُول کہتا ہُوں

اتفاقاً تمھارے ملنے کو
زندگی کا حصُول کہتا ہوں

جب میسّر ہوں ساغر و مینا
برق و باراں کو پھُول کہتا ہوں

---

○

جب سے دیکھا پری جمالوں کو
موت سی آگئی خیالوں کو

دیکھ تشنہ لبی کی بات نہ کر
آگ لگ جائے گی پیالوں کو

پھر اُفق سے کسی نے دیکھا ہے
مُسکرا کر خراب حالوں کو

فیض پہنچا ہے بارہا ساقی
تیرے مستوں سے اِن شوالوں کو

اِس اندھیروں کے عہد میں ساغرؔ
کیا کرے گا کوئی اُجالوں کو !

---

○

نہ کشتیوں نہ کناروں کا احترام کرو
فقط بھنور کے اشاروں کا احترام کرو

یہیں سے گزرے گا اِک روز کاروانِ بہار
فسردہ راہگذاروں کا احترام کرو

خزاں کی گود میں بھی پھول مسکرا اٹھیں
کچھ اس طرح سے بہاروں کا احترام کرو

نشاط و کیف کی دُنیا میں جھومنے والو
کبھی تو اُجڑے دیاروں کو احترام کرو

یہی ہے ذوقِ عبادت کی انتہا ساغرؔ!
غمِ حیات کے ماروں کا احترام کرو

---

○

فضا مغموم ہے ساقی! اُٹھا چھلکا ئیں پیمانہ
اندھیرا بڑھ چلا ہے لا ذرا قندیلِ مے خانہ

بہ فیضِ زندگی گذُرے ہیں ایسے مرحلوں سے ہم
کہ اپنے راستے میں اب نہ بستی ہے نہ ویرانہ

بس اتنی بات پر دُشمن بنی ہے گردشِ دوراں
خطا یہ ہے کہ چھیڑا کیوں تری زُلفوں کا افسانہ

چراغِ زندگی کو ایک جھونکے کی ضرورت ہے
تمھیں میری قسم ہے پھر ذرا دامن کو لہرانا

دِلوں کو شوق سے روندو، خرام ناز فرماؤ
اگر محشر ہوا تو پھر مجھے مُجرم نہ ٹھہرانا

تری محفل میں ساؔغر سا بھی کوئی اجنبی ہوگا
یہ ظالم ایک مُدّت سے نہ اپنا ہے نہ بیگانہ

---

○

خوشا کہ باغ و بہاراں ہے زندگی اپنی
کسی کے غم سے فروزاں ہے زندگی اپنی

بہت دِنوں سے پریشاں ہیں آپ کے گیسو
بہت دِنوں سے پریشاں ہے زندگی اپنی

غمِ حیات نے ڈالے ہیں ہاتھ بڑھ بڑھ کر
کہ بے وطن کا گریباں ہے زندگی اپنی

ترا جہان ہے کیا، اک آئینہ خانہ
کہ جس میں ششدر و حیراں ہے زندگی اپنی

نہ کوئی پھول نہ ساغر نہ ماہتاب نہ تو
بجھا ہوا سا شبستاں ہے زندگی اپنی

---

ہَوا بھیگی بھیگی فضا بھیگی بھیگی
چلو آج مانگیں دُعا بھیگی بھیگی

گھٹاؤں کو رحمت کی جوش آ گیا ہے
کوئی ہو گئی ہے خطا بھیگی بھیگی

دیارِ تمنّا میں دَم گھُٹ رہا ہے
ذرا چھیڑ مطرب نوا بھیگی بھیگی

ذرا صندلیں ہاتھ نزدیک لاؤ
سُلگنے لگی ہے حِنا بھیگی بھیگی

بھٹکنے لگیں بدلیاں حسرتوں کی
چمن در چمن ہے صبا بھیگی بھیگی

○

کِس کو بھاتی رہی رات بھر چاندنی
جی جلاتی رہی رات بھر چاندنی

ٹمٹماتے رہے حسرتوں کے دیئے
مُسکراتی رہی رات بھر چاندنی

اک حسیں جسم کی طرح آغوش میں!
کسمساتی رہی رات بھر چاندنی

اشک پیتے رہے ہم، کِسی اور کو
مے پلاتی رہی رات بھر چاندنی

ایک شبنم کے قطرے کی تقدیر کو!
آزماتی رہی رات بھر چاندنی

صبح دیکھا شگوفے تھے ٹوٹے ہوئے
گُل کھلاتی رہی رات بھر چاندنی

اُن کی زُلفوں کے سائے بہکتے رہے
لڑکھڑاتی رہی رات بھر چاندنی

رقص کرتے رہے داغہائے جگر
گنگناتی رہی رات بھر چاندنی

غم کے ساغر چھلکتے چھلکتے رہے!
جگمگاتی رہی رات بھر چاندنی

---

○

نہ خوفِ خُدا ہے نہ خوفِ خُدائی
بشر دے رہا ہے بشر کی دُہائی

نہ جانے کہاں کھو گئی ہے مروّت
بڑی دُور تک تو مِرے ساتھ آئی

نگاہوں کے انداز بدلے گئے ہیں
وہی ہے مگر رسمِ جلوہ نمائی

کسی کے مہکتے ہُوئے گیسوؤں سے
شگوفوں نے سیکھی ہے شُعلہ نوائی

فضائے مقدّر بدل دی ہے ساغرؔ
نظر جب کبھی زندگی سے ملائی

---

○

وقت کی عُمر کیا بڑی ہو گی
اِک ترے وصل کی گھڑی ہو گی

دستکیں دے رہی ہے پلکوں پر
کوئی برسات کی جھڑی ہو گی

کیا خبر تھی کہ نوکِ خنجر بھی
پھُول کی ایک پنکھڑی ہو گی

اے عدم کے مسافرو، ہشیار
راہ میں زندگی کھڑی ہو گی

کیوں گرہ گیسوؤں میں ڈالی ہے
جاں کسی پھول کی اڑی ہو گی

اِلتجا کا ملال کیا کیجے
اُن کے در پر کہیں پڑی ہو گی

موت کہتے ہیں جس کو اے ساغرؔ
زندگی کی کوئی کڑی ہو گی

---

○

یہ تیری گلیوں میں پھر رہے ہیں جو چاک داماں سے لوگ ساقی
کریں گے تاریخِ مے مرتّب یہی پریشاں سے لوگ ساقی

اگر یہ اندھیر اَور کچھ دِن رہا تو ایسا ضرور ہو گا
اُلجھ پڑیں گے بنامِ حالات زلفِ جاں سے لوگ ساقی

لگا کوئی ضرب اس ادا سے کہ ٹوٹ جائیں دِلوں کی مُہریں
تری قسم تنگ آ گئے ہیں سکوتِ پنہاں سے لوگ ساقی

لبوں پہ ہلکی سی مُسکراہٹ، جلو میں صد انقلاب رقصاں
نہ جانے آتے ہیں کس جہاں سے یہ حشر ساماں سے لوگ ساقی

کوئی نیا رنگ بخش اس کو، کوئی نئی رُوح پھونک اس میں
گریز کرنے لگیں گے ورنہ حدیثِ یزداں سے لوگ ساقی

چمن کی خیرات چند کانٹے ہی ڈال لے دامنِ طلب میں
وگرنہ مر جائیں گے لپٹ کر درِ گلستاں سے لوگ ساقی

یہ جگنوؤں کی چمک پہ بھی اب سنبھال لیتے ہیں اپنا خرمن
مجھے یقیں ہے کہ ڈر گئے ہیں شبِ چراغاں سے لوگ ساقی

خیال ہے میکدے میں اک بار اَور شعلوں کا راج ہوگا
شنید ہے انتقام لیں گے نشاطِ دوراں سے لوگ ساقی

○

تم نے جو چاہا وُہ دُنیا بن گئی
آگ تھی ، پھُولوں کا گجرا بن گئی

رات کچھُ یُوں مائلِ نغمہ تھا دل
چاندنی سازِ تمنّا بن گئی

میرے جامِ مے سے اُڑ کر ایک چھینٹ
صُبح کے ماتھے کا قشقہ بن گئی

موج و دریا میں نہیں ہے فرق کچھُ
موج لہرائی تو دریا بن گئی

جب کسی صُورت نہ عنواں مل سکا
آرزُو بے نام صحرا بن گئی

زندگی کی بات سُن کر کیا کہیں
اِک تمنّا تھی تقاضا بن گئی

تڑپ کر سوزِ دل کو جلوہ ساماں کر لیا مَیں نے
بہت بے نُور تھی دُنیا چراغاں کر لیا مَیں نے

خدا رکھے یہ طرزِ جور باقی تم نہ شرماؤ
اب اپنی آرزوؤں کو پشیماں کر لیا مَیں نے

اُٹھا کر چوم لی ہیں چند مرجھائی ہوئی کلیاں
نہ تم آئے تو یوں جشنِ بہاراں کر لیا مَیں نے

کسی کے اک تبسّم پر اساسِ زندگی رکھ لی
شراروں کو نشیمن کا نگہباں کر لیا مَیں نے

ابھی تک بے کفن سی ہے مری وحشت کی عُریانی
یہ کس امید پر گھر کو بیاباں کر لیا میں نے

کبھی ساغر بکف میں وجد میں آیا جو لہرا کر
تو اپنے ساتھ دُنیا کو بھی رقصاں کر لیا میں نے

○

کتنے غم، کتنے دُکھ اُبھر آئے
تیری یادوں نے پھول مہکائے

کون اُن بے وفا نگاہوں کو
دھڑکنوں کی زبان سمجھائے

تم نے اپنوں کی بات تک نہ سُنی
ہم نے غیروں کے درد اپنائے

اے نگارو! تمہاری بستی میں
راستہ بھول کر نکل آئے

عنبریں گیسوؤں کی اُلجھن نے
دو جہانوں کے راز اُلجھائے

ہم نے پھولوں کے واسطے ساغرؔ
خار زاروں میں ہاتھ پھیلائے

○

مرے سوزِ دل کے جلوے یہ مکاں مکاں اُجالے
مری آہِ پُر اثر نے کئی آفتاب ڈھالے

مجھے گردشِ فلک سے نہیں احتجاج کوئی
کہ متاعِ جان و دل ہے تری زُلف کے حوالے

یہ سماں بھی ہم نے دیکھا سرِ خاک رُل رہے ہیں
گُل و انگبیں کے مالک مہ و کہکشاں کے پالے

ابھی رنگ آنسوؤں میں ہے تری عقیدتوں کا
ابھی دِل میں بس رہے ہیں تری یاد کے شوالے

مری آنکھ نے سُنی ہے کئی زمزموں کی آہٹ
نہیں بربطوں سے کمتر مئے ناب کے پیالے

یہ تجلّیوں کی محفل ہے اسی کے زیرِ سایہ
یہ جہانِ کیف اس کا جسے وہ نظر سنبھالے

یہ حیات کی کہانی ہے فنا کا ایک ساغر
تو لبوں سے مُسکرا کر اسی جام کو لگالے

---

○

کچھ علاجِ وحشتِ اہلِ نظر بھی چاہیے
ایک پتّھر بر دُکانِ شیشہ گر بھی چاہیے

نامکمّل ہے سقوطِ کارواں کی داستاں
اس میں تھوڑا سا بیانِ راہبر بھی چاہیے

جن کے دامن میں دعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں
ان غریبوں کی دعاؤں میں اثر بھی چاہیے

گلستانِ آرزو کے انقلابی دَور میں
ایک جشنِ موسمِ برق و شرر بھی چاہیے

جو لگا دیتے ہیں قصرِ زندگی میں آگ سی
ایسے شعلوں کے لئے اک اشک تر بھی چاہیے

پھر انہی انگڑائیوں میں حشر کے سامان ہوں
بزمِ جاناں میں کوئی آشفتہ سر بھی چاہیے

ہوں نہ جس میں سنگ و میل کی پابندیاں
منزلوں تک ایک ایسی رہگذر بھی چاہیے

بھولی ہوئی صدا ہوں مجھے یاد کیجیے
تم سے کہیں مِلا ہوں مجھے یاد کیجیے

منزل نہیں ہوں، خضر نہیں، راہزن نہیں
منزل کا راستہ ہوں مجھے یاد کیجیے

میری نگاہِ شوق سے ہر گُل ہے دیوتا
مَیں عشق کا خُدا ہوں مجھے یاد کیجیے

نغموں کی ابتدا تھی کبھی میرے نام سے
اشکوں کی انتہا ہوں مجھے یاد کیجیے

گُم سُم کھڑی ہیں دونوں جہاں کی حقیقتیں
مَیں اُن سے کہہ رہا ہُوں مجھے یاد کیجیے

ساغؔر کسی کے حُسنِ تغافل شعار کی
بہکی ہوئی ادا ہُوں مجھے یاد کیجیے

○

دِن کٹ گئے جُنوں کے آلام کے سہارے
سب کام چل گئے ہیں اِک جام کے سہارے

بے چینیوں کی منزل، بیتابیوں کی راہیں
کیا ڈھونڈتا ہے اے دل! آرام کے سہارے

حیرت سے دیکھتا ہوں مجروح عشرتوں کو
اِک صُبح ہو رہی ہے اِک شام کے سہارے

اے سنگ دل زمانے! رُودادِ عاشقی کا
آغاز کر دیا ہے انجام کے سہارے

مایوسیوں کی مے سے مخمور ہو گئے ہیں
ٹوٹے ہوئے سبُو ہیں اب کام کے سہارے

کعبہ بھی پتّھروں کی اِک داستاں ہے یارو!
تقدیرِ بندگی ہیں اصنام کے سہارے

کتنی تجلّیوں سے گھر جل رہے ہیں ساغرؔ
کتنی حقیقتیں ہیں اوہام کے سہارے

---

○

روشن ہمیں سے منزلِ ہستی کے مرحلے
ہم کارواں کے ساتھ بہت دُور تک چلے

اس شامِ غم کے بعد ہے اِک ایسا راستہ
جس میں چراغ جلتے ہیں نغمات کے تلے

اِک عہدِ نو بھی اپنا مداوا نہ کر سکا
لُطف و عطا کی گود میں جور و ستم پلے

چھیڑیں کسی کے گیسوئے برہم کی داستاں
رنج و الم کی رات کسی طرح تو ٹلے

جلتی رہیں دیارِ محبت کی مشعلیں
کیا جانے آفتابِ تمنّا کہاں ڈھلے

پھرتے ہیں لوگ چاک گریباں گلی گلی
مجروح زندگی کو لگاتے ہوتے گلے

ساغر سلگ رہی ہے شگوفوں پہ چاندنی
سیرِ چمن کو نکلے ہیں دو چار دِل جلے

○

ہم خاک نشیں، خاک بسر شہر میں تیرے
کر لیں گے اسی طرح گزر شہر میں تیرے

جب تک تری گلیوں سے رہا ہم کو تعلّق
ہم رقص رہے شمس و قمر شہر میں تیرے

کچھ لوگ تمنّاؤں کا خوں چہرے پہ مل کر
بیٹھے ہیں سرِ راہ گزر شہر میں تیرے

اُٹھتے رہے کلیوں کی جوانی کے جنازے
جلتے رہے پھولوں کے نگر شہر میں تیرے

پلتی ہے تقدس کے لبادے میں حقارت
بجتے ہیں حوادث کے گجر شہر میں تیرے

ساغرؔ کی نگاہوں میں کھٹکتے ہیں ابھی تک
کجلائے ہوئے شام و سحر شہر میں تیرے

---

روداد محبّت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
دو دن کی مسرّت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

جب جام دیا تھا ساقی نے جب دَور چلا تھا محفل میں
وہ ہوش کی ساعت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

اب وقت کے نازک ہونٹوں پر مجروح ترنّم رقصاں ہے
بیدادِ مشیّت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

احساس کے مے خانے میں کہاں اب فکر و نظر کی قندیلیں
آلام کی شدّت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

کچھ حال کے اندھے ساتھی تھے کچھ ماضی کے عیّار سجن
احباب کی چاہت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

کانٹوں سے بھرا ہے دامنِ دل شبنم سے سلگتی ہیں پلکیں
پھولوں کی سخاوت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

اب اپنی حقیقت بھی ساغرؔ بے ربط کہانی لگتی ہے
دُنیا کی حقیقت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

○

غنچے فضائے نَو میں گرفتار ہو گئے
کچھ پھول اپنے رنگ سے بیزار ہو گئے

کِتنے تصوّرات ہواؤں میں اُڑ گئے
کِتنے خیال سایۂ دیوار ہو گئے

شبلیؔ کا پھول جذبۂ منصور کی صدا
راہِ وفا میں تیغ کی جھنکار ہو گئے

ڈھلتی رہیں شعور میں تاروں کی تابشیں
اِک جام پی کے صاحبِ اسرار ہو گئے

ہم بیکسوں کا چاند کی کرنوں سے واسطہ
زُلفوں کو چھُو لیا تو خطاوار ہو گئے

دِل کی چُبھن نے کیفِ تمنّا بڑھا دیا
کانٹے بھی آج صورتِ گلزار ہو گئے

پروانے بن گئے ہیں چمبیلی کی نکہتیں
کیا! دیکھنا کہ صبح کے آثار ہو گئے

ساؔغر کا بجلیوں نے سماں اور کر دیا
ہم ظلمتوں سے کھیل کے انوار ہو گئے

○

کچھ حرفِ التجا تھے دعاؤں سے ڈر گئے
ارمان بندگی کے خداؤں سے ڈر گئے

اب کون دیکھتا ہے ترے شمس کی طرف
سورج مکھی کے پھول شعاعوں سے ڈر گئے

ہنس کر جو جھیلتے تھے زمانے کی تلخیاں
اے چشمِ یار! تیری اداؤں سے ڈر گئے

رنگیں فضا میں جل گئیں خاموش تتلیاں
آنچل اُڑے تو پھول ہواؤں سے ڈر گئے

آہوں کو اعتبارِ سماعت سمجھ لیا
نغموں کی بے قرار صداؤں سے ڈر گئے

ساقی نے مُسکرا کے گلے سے لگا لئے
وہ آدمی جو اپنی خطاؤں سے ڈر گئے

تشنہ لبی نے ساغر و مینا کو ڈس لیا
زلفوں کی مست مست گھٹاؤں سے ڈر گئے

○

حادثے کیا کیا تمھاری بے رُخی سے ہو گئے
ساری دُنیا کے لئے ہم اجنبی سے ہو گئے

گردشِ دوراں، زمانے کی نظر، آنکھوں کی نیند
کتنے دشمن ایک رسمِ دوستی سے ہو گئے

کچھ تمہارے گیسوؤں کی برہمی نے کر دیئے
کچھ اندھیرے میرے گھر میں روشنی سے ہو گئے

یُوں تو ہم آگاہ تھے صیّاد کی تدبیر سے
ہم اسیرِ دامِ گُل اپنی خوشی سے ہو گئے

بندہ پرور! کھل گیا ہے آستانوں کا بھرم
آشنا کچھ لوگ رازِ بیخودی سے ہو گئے

ہر قدم ساغرؔ! نظر آنے لگی ہیں منزلیں
مرحلے کچھ طے مری آوارگی سے ہو گئے

○

اے تغیّرِ زمانہ یہ عجیب دل لگی ہے
نہ وقارِ دوستی ہے نہ مجال دشمنی ہے

یہی ظلمتیں چھنیں جو ترے سُرخ آنچلوں میں
انہی ظُلمتوں سے شاید مِرے گھر میں روشنی ہے

مِرے ساتھ تم بھی چلنا، مرے ساتھ تم بھی آنا
ذرا غم کے راستوں میں بڑی تیز تیرگی ہے

یہ مشاہدہ نہیں ہے مرے درد کی صدا ہے
مرے داغِ دِل لُٹے ہیں تری بزم جب سجی ہے

غمِ زندگی! کہاں ہے ابھی وحشتوں سے فرصت
ترے ناز اُٹھا ہی لیں گے ابھی زندگی پڑی ہے

جسے اپنا یار کہنا اُسے چھوڑنا بھنور میں
یہ حدیثِ دلبراں ہے یہ کمالِ دلبری ہے!

وہ گزر گیا ہے ساغرؔ کوئی قافلہ چمن سے
کہیں آگ جل رہی ہے کہیں راکھ سو گئی ہے

○

یاد آ کے رہ گئے ہیں زمانے وفاؤں کے
شعلے جگا کے چل دیئے جھونکے ہواؤں کے

ہر اک قدم پہ تلخیٔ دوراں کی دھوپ تھی
تھے ہم بھی اس گلی میں طلبگار چھاؤں کے

کرتے رہے جو چاند ستاروں کی رہبری
کچھ لوگ منتظر ہیں انہیں رہنماؤں کے

بے چارگیٔ زیست کا دامن نہ بھر سکا
ہم نے لٹا دیئے ہیں خزانے دعاؤں کے

تجدیدِ ذوقِ ساغر و مینا کی بات کر
بدلے ہوتے ہیں رنگ چمن کی فضاؤں کے

---

نکلے صدف کی آنکھ سے موتی مرے ہُوئے
پھُولوں کے دامنوں میں ہیں کانٹے چھُپے ہُوئے

ہے اہتمامِ گریہ و ماتم چمن چمن
رکھے ہیں مقتلوں میں جنازے سجے ہُوئے

ہر ایک سنگِ میل ہے اب ننگِ رہ گزر
ہیں رہبروں کی عقل پہ پتّھر پڑے ہُوئے

بے وجہ تو نہیں ہیں چمن کی تباہیاں
کچھ باغباں ہیں برق و شرر سے مِلے ہوئے

ساغرؔ یہ وارداتِ سخن بھی عجیب ہے
نغمہ طرازِ شوق ہُوں لب ہیں سلے ہُوئے

○

پُوچھا کِسی نے حال کسی کا تو رو دیئے
پانی میں عکس چاند کا دیکھا تو رو دیئے

نغمہ کسی نے ساز پہ چھیڑا تو ہنس پڑے
غنچہ کسی نے شاخ سے توڑا تو رو دیئے

اُڑتا ہُوا غبار سرِ راہ دیکھ کر !
انجام ہم نے عشق کا سوچا تو رو دیئے

بادل فضا میں آپ کی تصویر بن گئے
سایہ کوئی خیال سے گذرا تو رو دیئے

رنگِ شفق سے آگ شگوفوں میں لگ گئی
ساغر ہمارے ہاتھ سے چھلکا تو رو دیئے

○

وہ عزم ہو کہ منزلِ بیدار ہنس پڑے
ہر نقشِ پا پہ جراُتِ رہوار ہنس پڑے

حیران ہو رہی ہے شگوفے پہ چاندنی !
شاید قفس میں آج گرفتار ہنس پڑے

مِٹ جائے تیرے نام سے ہر تلخئ جفا !
وُہ کام کر کہ بے کس و نادار ہنس پڑے

میرے جنوں نے آج وہ سجدہ ادا کیا!
بُت خانۂ حیات کے آثار ہنس پڑے

پھر شادماں ہوئے ہیں خرابے حیات کے
ساغرؔ کسی کے گیسوئے خم دار ہنس پڑے

---

جو حادثے یہ جہاں میرے نام کرتا ہے
مرا شعور اُنہیں نذرِ جام کرتا ہے

ہمارے چاکِ گریباں سے کھیلنے والو!
ہمیں بہار کا سُورج سلام کرتا ہے

ہمیں سے قوسِ قزح کو ملی ہے رنگینی
ہمارے در پہ زمانہ قیام کرتا ہے

یہ میکدہ ہے یہاں کی ہر ایک شے کا حضُورٗ!
غمِ حیات بُہت احترام کرتا ہے

یہی شراب، یہی بے نظیر شے ساقی
اسی کا رنگ ہمیں لالہ فام کرتا ہے

فقیہہِ شہر نے تہمت لگائی ساغر پر
یہ شخص درد کی دولت کو عام کرتا ہے

---

○

چراغِ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے
ذرا نقاب اُٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے

وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
انھیں کہیں سے بلاؤ بڑا اندھیرا ہے

مجھے تمھاری نگاہوں پہ اعتماد نہیں
مرے قریب نہ آؤ بڑا اندھیرا ہے

فرازِ عرش سے ٹوٹا ہوا کوئی تارا
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ، بڑا اندھیرا ہے

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے
ابھی قریب نہ آؤ بڑا اندھیرا ہے

بصیرتوں پہ اُجالوں کا خوف طاری ہے
مجھے یقین دِلاؤ بڑا اندھیرا ہے

جسے زبانِ خرد میں شراب کہتے ہیں
وُہ روشنی سی پلاؤ! بڑا اندھیرا ہے

بنامِ زہرہ جبینانِ خطّۂ فردوس
کِسی کرن کو جگاؤ! بڑا اندھیرا ہے

○

زخمِ دل پُر بہار دیکھا ہے
کیا عجب لالہ زار دیکھا ہے

جن کے دامن میں کچھ نہیں ہوتا
اُن کے سینوں میں پیار دیکھا ہے

خاک اُڑتی ہے تیری گلیوں میں
زندگی کا وقار دیکھا ہے

تشنگی ہے صدف کے ہونٹوں پر
گُل کا سینہ فگار دیکھا ہے

ساقیا! اہتمامِ بادہ کر
وقت کو سوگوار دیکھا ہے

جذبۂ غم کی خیر ہو ساغرؔ
حسرتوں پر نکھار دیکھا ہے

---

○

ہر شے ہے پُر ملال بڑی تیز دُھوپ ہے
ہر لب پہ ہے سوال بڑی تیز دُھوپ ہے

چکرا کے گر نہ جاؤں مَیں اس تیز دُھوپ میں
مجھ کو ذرا سنبھال بڑی تیز دُھوپ ہے

دے حکم بادلوں کو خیاباں نشیں ہوں میں
جام و سبُو اُچھال بڑی تیز دُھوپ ہے

ممکن ہے ابرِ رحمتِ یزداں برس پڑے
زلفوں کی چھاؤں ڈال بڑی تیز دُھوپ ہے

اب شہرِ آرزو میں وہ رعنائیاں کہاں
ہیں گلکدے نڈھال بڑی تیز دھوپ ہے

سمجھی ہے جس کو سایۂ اُمید عقلِ خام
ساغرؔ کا ہے خیال بڑی تیز دھوپ ہے

---

○

مآلِ نغمہ و ماتم فروخت ہوتا ہے
خوشی کے ساتھ یہاں غم فروخت ہوتا ہے

وہ جس کو آج بھی کچھ لوگ حُسن کہتے ہیں
بصد نگارشِ بیہم فروخت ہوتا ہے

فریب خوردہ تبسّم خریدنے کے لئے
وقارِ دیدۂ پُرنم فروخت ہوتا ہے

بڑے حسین گھنیرے سیاہ پردوں میں
جمالِ عصمتِ مریم فروخت ہوتا ہے

بہارِ وادیٔ گنگ و جمن کے ساتھ یہاں
وقارِ کوثر و زمزم فروخت ہوتا ہے

وہ جسمِ مرمریں، نظریں بھی جس کو چھُو نہ سکیں
برائے رونقِ عالم فروخت ہوتا ہے

طلسم خانۂ صد رنگ و بُو میں اے ساؔغر
فریبِ شعلہ و شبنم فروخت ہوتا ہے

○

ساقی کی اِک نگاہ کے افسانے بن گئے
کچھ پھول ٹوٹ کر مرے پیمانے بن گئے

کاٹی جہاں تصوّرِ جاناں میں ایک شب
کہتے ہیں لوگ اس جگہ بُت خانے بن گئے

جن پر نہ سائے زُلفِ غزالاں کے پڑ سکے
احساس کی نگاہ میں ویرانے بن گئے

جو پی سکے نہ سُرخ لبوں کی تجلّیاں
دُنیا کے تجربات سے انجانے بن گئے

ساغرؔ وہی مقام ہے اِک منزلِ فراز
اپنے بھی جس مقام پہ بیگانے بن گئے

---

○

ہم بیخود و سرشار سدا زندہ رہیں گے
حالات کے میخوار سدا زندہ رہیں گے

کچھ واقفِ آدابِ محبّت نہیں مرتے
کچھ صاحبِ اسرار سدا زندہ رہیں گے

احساس کے پھولوں کو خزاں چھو نہیں سکتی
اُلفت کے چمن زار سدا زندہ رہیں گے

ہے اپنا جنوں عظمتِ دوراں کی کہانی
عظمت کے طلبگار سدا زندہ رہیں گے

ہے قصرِ حقیقت میں ترے دم سے اُجالا
ساغرؔ ترے افکار سدا زندہ رہیں گے

برگشتہ یزداں سے کچھ بھول ہوئی ہے
بھٹکے ہوئے انساں سے کچھ بھول ہوئی ہے

تا حدِّ نظر شعلے ہی شعلے ہیں چمن میں
پھولوں کے نگہباں سے کچھ بھول ہوئی ہے

جس عہد میں لُٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس عہد کے سُلطاں سے کچھ بھول ہوئی ہے

ہنستے ہیں مری صورتِ مفتوں پہ شگوفے
میرے دلِ ناداں سے کچھ بھول ہوئی ہے

حُوروں کی طلب اور مے و ساغر سے ہے نفرت
زاہد! ترے عرفاں سے کچھ بھول ہوئی ہے

○

پھولوں کو آگ لگ گئی نغمات جل گئے
سورج کی تیز دھوپ میں لمحات جل گئے

اب دامنِ حیات میں کچھ بھی نہیں رہا
فردا کی سرد آگ میں حالات جل گئے

کلیاں چٹک رہی ہیں کہ شاخوں پہ آبلے
غنچوں کی نکہتوں سے مرے ہات جل گئے

اب کے برس بہار بصیرت کو ڈس گئی
فکر و نظر کے جھومتے باغات جل گئے

ساغر لُٹے لُٹے ہیں ستارے بجھے بجھے
شاید مرے نصیب کے دن رات جل گئے

---

○

یارب ترے جہان کے کیا حال ہو گئے
کچھ لوگ خواہشات کے دلّال ہو گئے

تپتی رہی ہے آس کی کرنوں پہ زندگی
لمحے جُدائیوں کے مہ و سال ہو گئے

بھُولی ہے رنگ رنگ کو دُنیا کی ترنگی!
نغمے ربابِ وقت کے بے تال ہو گئے

وحشت میں اپنے تارِ گریباں ہی دوستو!
اُلجھے تو ہر قدم پہ گراں جال ہو گئے

ساغر جو کل کھِلے تھے وہ غنچے کہاں گئے
ہنگامۂ بہار میں پامال ہو گئے

○

آنکھ روشن ہے جیب خالی ہے
ظلمتوں میں کرن سوالی ہے

حادثوں نے رباب چھیڑے ہیں
وقت کی آنکھ لگنے والی ہے

حُسن پتّھر کی ایک مُورت ہے
عشق پھُولوں کی ایک ڈالی ہے

آئنے سے حضور کے مانند
چشم کا واسطہ خیالی ہے

موت اک انگبیں کا ساغر ہے
زندگی زہر کی پیالی ہے

خرد بخیر! جنوں کو سلام کرنا ہے
جہانِ عشق میں اب اور کام کرنا ہے

یہ رنگ و بُو کے خزانے بڑے درخشاں ہیں
دِل و نگاہ کو بھی لالہ فام کرنا ہے

کتابِ صورتِ کونین یُوں اُٹھانا ہے
کہ ذرّے ذرّے کو مہرِ دوام کرنا ہے

صدائے بُوذرؓ و سلمانؓ یہی تھی دُنیا میں
مسرّتوں کو غریبوں کے نام کرنا ہے

جنھیں خدا کی طرح بولنے کی عادت ہے
انھیں زبانِ بشر میں کلام کرنا ہے

مِرے شعور کو حاجت نہیں تکلّف کی
تجلّیوں کو نظر کا غلام کرنا ہے

کوئی حقیر سی شے ڈال میرے ساغر میں
کہ زندگی کو برائے عوام کرنا ہے

---

پریشاں عکسِ ہستی، آئینہ بے نور دیکھا ہے
مِری آنکھوں نے افسردہ چراغِ طُور دیکھا ہے

سُرور و کیف کا معیار اپنی ذات ہے ساقی
شرابِ درد سے ہر جام کو معمُور دیکھا ہے

بڑی مُدّت سے آشفتہ اُمیدیں یاد کرتی ہیں
کہیں اُس بزم میں یارو دلِ مجبُور دیکھا ہے!

یہ دستورِ وفا صدیوں سے رائج ہے زمانے میں
صدائے قرب دی جن کو اُنہی کو دُور دیکھا ہے

کہیں لختِ جگر کھانے سے ساغرؔ بھوک مٹتی ہے
لہُو کے گھونٹ پی کر بھی کوئی مخمور دیکھا ہے؟

○

ان بہاروں پہ گلستاں پہ ہنسی آتی ہے
دِل کے ہر داغِ فروزاں پہ ہنسی آتی ہے

آج پھر جام تہی اور گھٹا اُٹھی ہے
آج پھر رحمتِ یزداں پہ ہنسی آتی ہے

میری بھیگی ہوئی پلکوں کی چھما چھم پہ نہ جا
تیرے ٹوٹے ہوئے پیماں پہ ہنسی آتی ہے

جب کبھی بچھڑا ہوا دوست ملا ہے کوئی
مجھ کو اخلاصِ عزیزاں پہ ہنسی آتی ہے

مجھ کو اِک زہر کا چھلکا ہوا ساغر دے دو
مجھ کو اس دور کے انساں پہ ہنسی آتی ہے

○

موج در موج کناروں کو سزا ملتی ہے
کوئی ڈوبے تو سہاروں کو سزا ملتی ہے

میکدے سے جو نکلتا ہے کوئی بے نشّہ!
چشمِ ساقی کے اشاروں کو سزا ملتی ہے!

آپ کی زلفِ پریشاں کا تصوّر توبہ
نگہت و نور کے دھاروں کو سزا ملتی ہے

جب وہ دانتوں میں دباتے ہیں گلابی آنچل
کتنے پُر کیف نظاروں کو سزا ملتی ہے

میرے پیمانے میں ڈھل جاتا ہے پھولوں کا ثبات
میرے ساغر میں بہاروں کو سزا ملتی ہے

نگارِ معیشت لہو رو رہی ہے
تصوّر کی عظمت لہو رو رہی ہے

شگوفوں کی عزّت پہ چھاپے پڑے ہیں
چمن کی لطافت لہو رو رہی ہے!

پلا ساقیا! کوئی جامِ غزالیں
بھٹکتی بصیرت لہو رو رہی ہے

فقیروں کے اخلاص کی بے زبانی
بروتے جہالت لہو رو رہی ہے

نہ سجدے نہ سجدوں کی تعبیر ساغؔر
جبینِ شہادت لہو رو رہی ہے

نظر نظر بیقرار سی ہے نفس نفس پُر اسرار سا ہے
میں جانتا ہوں کہ تم نہ آؤ گے پھر بھی کچھ انتظار سا ہے

میرے عزیزو! میرے رفیقو! کوئی نئی داستان چھیڑو
غمِ زمانہ کی بات چھوڑو یہ غم تو اب سازگار سا ہے

کبھی تو آؤ! کبھی تو بیٹھو! کبھی تو دیکھو! کبھی تو پوچھو
تمہاری بستی میں ہم فقیروں کا حال کیوں سوگوار سا ہے

چلو! کہ جشنِ بہار دیکھیں چلو! کہ ظرفِ بہار جانچیں!
چمن چمن روشنی ہوئی ہے کلی کلی پر نکھار سا ہے!

یہ زُلف بردوش کون آیا! یہ کس کی آہٹ سے گُل کھِلے ہیں
مہک رہی ہے فضائے ہستی تمام عالم بہار سا ہے

تہذیبِ جنوں کار پہ تنقید کا حق ہے
گِرتی ہوئی دیوار پہ تنقید کا حق ہے

ہاں! میں نے لہو اپنا گُلستاں کو دیا ہے
مُجھکو گُل و گُلزار پہ تنقید کا حق ہے

میں یاد دلاتا ہوں شکایت نہیں کرتا
بھُولے ہُوئے اقرار پہ تنقید کا حق ہے

مجرُوح جو کردے دلِ انساں کی حقیقت
اُس شوخیٔ گفتار پہ تنقید کا حق ہے!

○

دُکھ درد کی سوغات ہے دُنیا تِری کیا ہے
اشکوں بھری برسات ہے دُنیا تِری کیا ہے

کچھ لوگ یہاں نورِ سحر ڈھونڈ رہے ہیں
تاریک سی اک رات ہے دُنیا تِری کیا ہے

تقدیر کے چہرے کی شِکن دیکھ رہا ہوں
آئینۂ حالات ہے دُنیا تِری کیا ہے

مجروح تقدّس ہے تقدّس کی حقیقت
رودادِ خرابات ہے دُنیا تِری کیا ہے

ساغر میں چھلکتے ہیں سماوات کے اسرار
ساقی کی کرامات ہے دُنیا تِری کیا ہے

○

لا اِک خُمِ شراب کہ موسم خراب ہے
کر کوئی انقلاب کہ موسم خراب ہے

زُلفوں کو بیخودی کی رِدا میں لپیٹ کے
ساقی پئے شباب کہ موسم خراب ہے

غنچوں کو اعتبارِ طلوعِ چمن نہیں
رُخ سے اُلٹ نقاب کہ موسم خراب ہے

جام و سبو کے ہوش ٹھکانے نہیں ذرا
مطرب اُٹھا رُباب کہ موسم خراب ہے

اے جاں کوئی تبسّمِ رنگیں کی واردات
پھیکا ہے ماہتاب کہ موسم خراب ہے

---

نکلے صدف کی آنکھ سے موتی مرے ہوئے
پھوٹے ہیں چاندنی میں شگوفے جلے ہوئے

ہے اہتمامِ گریہ و ماتم چمن چمن
رکھے ہیں مقتلوں میں جنازے سجے ہوئے

ہر ایک سنگِ میل ہے اب ننگِ رہگذر
ہیں رہبروں کی عقل پہ پتھر پڑے ہوئے

بے وجہ تو نہیں ہیں چمن کی تباہیاں
کچھ باغباں ہیں برق و شرر سے ملے ہوئے

ساغرؔ یہ وارداتِ سخن بھی عجیب ہے
نغمہ طرازِ شوق ہوں لب ہیں سلے ہوئے

اے دوست یہاں ویرانوں کو گلزار سمجھنا پڑتا ہے
کچھ اُونچی نیچی راہوں کو ہموار سمجھنا پڑتا ہے

احساس کے اُلٹے پاؤں سے جب چلتے چلتے تھک جائیں
تو راہگذر کو اے راہی دیوار سمجھنا پڑتا ہے

مجرُوح معیشت کے ہاتھوں انسان کا اب یہ عالم ہے
ہر زخم لگانے والے کو غم خوار سمجھنا پڑتا ہے

جب شاہی قباؤں کی خاطر کچھ جسم برہنہ ہو جائیں
اُس وقت غلاموں کو ساغرؔ مختار سمجھنا پڑتا ہے

فراز تیرے گریباں پہ کل جو ہنستا تھا
اسے دیکھ تو دریدہ لباس تھا وہ بھی

وہ ایک شخص کہ سورج کے روپ میں آیا
چراغ لے کے گیا شمع فراز بن کر